12

2305

PRICE IN PAKISTAN
RS 3/7

251

ہچکیاں

صدیقہ بیگم

ہچکیاں

MUNICIPAL LIBRARY
Nankana
Sahib.

پربھات پبلشرز الہ آباد

MC LIBRARY Nankana Sahib
Acc. NO: 00388ND
Date: 06-4-2022
Managed by Chughtai Public Library

جملہ حقوق بہ حق مصنف محفوظ

891-4393
S125H

پہلا اڈیشن اگست سنہ ۱۹۴۴ء
دوسرا اڈیشن مئی سنہ ۱۹۵۰ء

قیمت ۲/۱۲

بی، ایل، بھٹناگر نے اسرار کریمی پریس الہ آباد سے چھپوا کر پربھات پبلشرز کے لیے
شائع کیا

سسکتی ہوئی تہذیب کے نام

صدیقہ بیگم

ترتیب

دو باتیں

"ہچکیاں" کی پہلی اشاعت کو کئی سال گزر گئے۔ یوں تو ۱۵ راگست سے پہلے ہی اسکا پہلا اڈیشن ختم ہوگیا مگر آزادی کے بعد جو ہنگامے ہوئے تو کتاب چھاپنے، چھپوانے کی کسے فرصت۔ جان کے لالے پڑے ہوئے تھے۔ پھر جو اس سے فرصت ملی تو نئے مجموعوں کی فکر لاحق ہوئی اب جبکہ اور مجموعوں سے مطمئن ہوگئی ہوں تو "ہچکیاں" چھاپنے کے لئے ایک نئے ناشر نے بیر بہوٹی کیطرح پنجے کھولے۔ نئے ناشر کو نئے نمازی کے معنوں میں نہ سمجھئے گا۔ میں نے اسکو ان اصطلاحی معنوں میں استعمال نہیں کیا ہے۔ ہاں تو ہمارے نئے ناشر بھٹناگر صاحب نے ایک ایسے وقت میں اُردو کی کتابیں چھاپنے کا ارادہ کیا جبکہ قانون ساز اسمبلی نے اسکے ساتھ سوتیلی ماں کا سا سلوک کیا۔ اور اس کے ساتھ ہی کیا اس نے تو ایک ہی ڈنڈے سے سب کو ہانکا۔ بنگالن منہ بسور کر رہ گئی، اسکے گیت اسکی آواز سے اُلجھ کر رہ گئے اور گلے میں تو جیسے پھندا پڑ گیا۔ "جن گن من" گانے والے مایوس ہونے ہی والے تھے کہ اندھیرے کے سینے سے کرن پھوٹنے لگی۔ یہ کرن کونسی ہے۔ یہ کلکتے کے گلی کوچے آپ سے بتائیں گے، تاریخ کے سادہ اوراق اسکے منتظر ہیں، ہاں تو میں کہہ رہی تھی کہ اردو ہی کیا اس

اسمبلی نے تو مدراسی، تامل، تیلگو، مرہٹی، گجراتی، پنجابی، سب کے ہی منہ سی دئے۔ مگر میں کہتی ہوں کہ یہ ہونٹ کیا ان ٹانکوں سے بند رکھے جاسکتے ہیں۔ میں نے سوتیلی ماں کی تشبیہ اس اسمبلی کے ساتھ غلط دی، آپ لوگ معاف کریں۔ ماں کا اطلاق ہی دراصل غلط ہے اور یہ بات آپکو ہمالہ سے لیکر راس کماری تک ایک ایک شخص بتا سکتا ہے، ہندستان کے ننگے بھوکے عوام بتا سکتے ہیں۔

اور آج جبکہ بھٹناگر صاحب اردو کی کتابیں چھاپ رہے ہیں اسوقت وہ اس نام نہاد ماں کے منہ پر تھپڑ مار رہے ہیں، جس نے ماں کا چولا پہن رکھا ہے۔

بھٹناگر صاحب کا ہات تاریخ کی نبض پر ہے وہ جانتے ہیں کہ سامراجی اصول زبانوں کے ارتقا کے راستے میں چاہیں تو لوہے کی فصیلیں کھڑی کردیں، مگر بدلتے وقت کی رفتار کو نہ روک سکیں گے آج چین میں عوام کی زبانیں پھر ارتقا کے راستے پر لگ گئی ہیں اور چیانگ کائی شیک انکا کچھ نہ بگاڑ سکا، تاریخ نے دیکھ لیا کہ یہ زبانیں اپنے خطوں میں پہنچ گئی ہیں اور چیانگ کائی شیک کے نام کے سامنے ایک بڑا سوالیہ نشان ہے۔

یہ مجموعہ من وعن اسی صورت میں شائع کیا جارہا ہے، اور میرے افسانوں کو صحیح معنوں میں سمجھنے کیلئے بیحد کارآمد ثابت ہوگا۔ "ہچکیاں" کی کہانیوں کے بغیر میری ابتک کی لکھی ہوئی کہانیاں نامکمل ہیں۔

مجھے امید ہے کہ میری کہانیوں کے شائقین اس مجموعہ کو اسی دلچسپی سے پڑھیں گے۔

اس مجموعے کی اشاعت کے سلسلہ میں، میں ہاشم صاحب اور اطہر پرویز (جو ان دنوں ترنگے کی جیل میں ہیں) کی بیحد مشکور ہوں جنھوں نے اسکی اشاعت میں میرا اور بھٹناگر صاحب کا برابر ہات بٹایا۔

میں سمجھتی ہوں کہ اب نماز ختم ہوگئی، سلام پھیر لیا آئے دعا کیلئے ہات اٹھائیں اور بس ——

صدیقہ بیگم
۱۲ فروری ۱۹۵۰ء

۱۶ بلوا گھاٹ روڈ
الہ آباد

پیش لفظ

اُردو ادب میں افسانہ کی عمر اتنی کم ہے کہ اگر وہ اس مرتبہ کو نہ پہنچتا جو آج اسے نصیب ہے تو بھی کوئی شکایت نہ ہو سکتی مگر ہونہار بروا کے چکنے چکنے پات ابتدا ہی سے اس نے اس خوبی کے ساتھ اپنی رفتار بڑھائی کہ آج صنفِ نثر میں اس کا کوئی مقابل تو کیا ہم عنان بھی نہیں رہا۔ ادب کے میدان میں اس نے تنقید، تاریخ، ناول، ڈرامہ سب کو بہت پیچھے چھوڑ دیا۔ اس کی ترقی کی وجہ صرف یہی نہیں کہ افسانہ بنفسہٖ دلچسپ ہے بلکہ اُسکو کچھ ایسے اچھے لکھنے والے مل گئے جنھوں نے کہانی کو صرف تفریح کا آلہ کار نہیں بنایا بلکہ اس کی دلچسپی کو زندگی اور عام زندگی سے اتنا ہم آہنگ کر دیا کہ آج کوئی افسانہ جس کے پیشِ نظر حیاتِ عامّہ نہیں۔ وہ عام دلچسپی کا مرکز بھی نہیں بن سکتا۔ ممکن ہے اس نظریہ سے الگ ہو کر بھی بعض افسانے چند دن کی حیات یا ہر دلعزیزی حاصل کر لیں

لیکن ان کی بقا سینما کی ایسی چلتی پھرتی تصویروں سے زیادہ نہیں جو وقتی طور پر تفریحی و نفسانی اُمنگوں کو خواب کی نسبت عطا کر کے ختم ہو جاتی ہیں۔ ایسے افسانے صرف افسانے کی طرح پڑھے جاتے ہیں۔ ان کی حقیقت سمجھ کر شاید ہی کوئی اثر لیتا ہو اور افسانہ کی یہ بڑی بدنصیبی ہے کہ وہ حقیقت سمجھا جائے۔

اُردو، مختصر افسانہ پریم چند کے بعد ایک خاص منزل پر ٹھہر گیا تھا اور کبھی کبھی خیال ہوتا تھا کہ شاید ذہنی لحاظ سے اب یہ صنعت آگے نہ بڑھ سکے اس لئے کہ ایک عرصہ تک اس فن کو سنوارنے والے پریم چند کا کارنامہ رکھ کر قلم اُٹھاتے رہے۔ مگر کرشن چندر اور چند اور فن کاروں نے اس ٹھہراؤ کو بیک جنبش قلم ختم کر کے اُردو کی اس صنعت کو وہ ترقی دی کہ اب ہم نہایت اطمینان کے ساتھ بعض افسانوں کو دنیا کے بہترین افسانوں کے مقابلہ میں پیش کر سکتے ہیں۔ ان افسانوں میں زندگی اور زندگی کے رموز تہ در تہ قصہ کہانی کے بھیس میں ہمارے سامنے آتے رہتے ہیں بحر حیات کی چھوٹی بڑی لہریں اپنی اصلی روپ میں ہمارے احساس کو حقیقت سے ہم کنار کر دیتی ہیں۔ زندگی کی ضروریات سیاست کی شعبدہ گری، سماج کی کش مکش اور سب کا انجام آج اُردو کے اچھے افسانوں میں ڈھونڈھ لینا مشکل کام نہیں، صرف سخن شناسی اور ذوق نظر کی ضرورت ہے۔ دورِ حاضر میں اگر آپ کو سماجی و سیاسی تاریخ کی تلاش ہے تو آپ پارلیمنٹ کی تقریریں سنیں یا نہ سنیں لیڈروں کے بیانات پڑھیں یا نہ پڑھیں، محض اچھے افسانوں کو دیکھ لیں تو پوست کندہ حالات ہر جگہ سے بہتر آپ کو ان افسانوں کے اوراق میں نہایت دلکش طریقے سے مل جائیں گے۔

آج کا ہر اچھا افسانہ حیات کی ترجمانی پوری طرح کر دیتا ہے مثال کے لئے صدیقہ بیگم کے کے پیش نظر مجموعہ 'ہچکیاں' ملاحظہ فرمایئے۔ جس میں موجودہ زندگی کے مختلف مسائل اور سماج کی ابتری کا نقشہ ہر جگہ مل جائے گا۔

صدیقہ بیگم کے اس مجموعہ میں زیادہ تر ایسے افسانے ملیں گے جو پہلے مختلف رسالوں میں چھپ چکے تھے اور بعد میں مجموعہ کی صورت میں پہلی مرتبہ شائع ہوئے اور اب دوسری مرتبہ پھر چھپ کر آپ کے سامنے آ گئے ہیں۔ اس کو دو آتشہ و سہ آتشہ بنا کر علم و ادب کی محفل میں پیش نہیں کیا جا رہا ہے۔ بلکہ وہی شراب ہے اور وہی بوتل نہ شراب بدلی ہے نہ بوتل اور نہ مے خوار جب سے انھوں نے افسانے لکھنے شروع کئے ہیں سیاسی و سماجی فضا کم و بیش یکساں ہے کہنے سننے کے لئے نظام بدل گیا ہے مگر لوگ اتنا بھی نہیں بدلے نظم جہاں میں قدریں بدل گئی ہیں۔ مگر ہندستان و پاکستان میں ابھی وہی زاویۂ نگاہ کارفرما ہے جو سنگ سے پہلے تھا۔ اسی لئے ان افسانوں میں اب تک زندگی ہے اور زمانہ کو ان کی ضرورت بار بار محسوس ہو رہی ہے اور اگر زمانہ بدل بھی جائے تب بھی ہم کو یقین ہے کہ ان افسانوں کی اہمیت نہ بدلے گی۔ اول تو اپنے دور کی پوری عکاسی ان اوراق میں موجود ہے جو آئندہ نسلیں بھی دیکھنا چاہیں گی اور دوسرے یہ کہ ان افسانوں میں نکتہ رسی، فنی اہمیت خلوص و مشاہدہ کا اتنا اچھا امتزاج ہے کہ مذاق سلیم ہمیشہ اس کو پسندیدہ نظروں سے دیکھتا رہیگا۔

ایک خاص بات جو فنی لحاظ سے ان افسانوں میں سب سے پہلے ہم کو محسوس

ہوتی ہے وہ یہ ہے کہ افسانہ کو رنگین بیانی یا پُرجوش اور بھاری بھرکم الفاظ کا سہارا دیکر دلکش بنانے کی کوشش نہیں کی گئی۔ بلکہ واقعات کی اہمیت اور تفصیل کو ایسے موقع اور ایسے سیدھے سادے الفاظ میں قلم بند کر دیا گیا ہے کہ افسانوی عنصر خود بخود پڑھنے والے کو مسحور کر لیتے ہیں اور ساتھ ہی ساتھ یہ انداز بیان کہ جیسے کچھ نہیں کہا جا رہا ہے اور سب کچھ خود بخود ماحول سے یکجا ہوکر ذہن پر چھائے جا رہے ہیں ——— اُردو افسانوی ادب میں ان افسانوں میں آپ کو لمبے واقعات کی لمبی چوڑی تفصیل بھی ملے گی اور اور کبھی نہایت دلکش ایجاز و اختصار بھی لیکن نہ تفصیل سے طبیعت گھبراتی ہے نہ اختصار سے دم اُلجھتا ہے دونوں افراد اپنے موقع و محل سے اتنے مناسب مقامات پر پیش کئے جاتے ہیں کہ پڑھنے والا سمجھتا ہے کہ اسوقت اسطرح بیان کرنے کی ضرورت تھی گویا واقعہ نگاری پر اتنا عبور حاصل ہوگیا ہے کہ موضوع اور افسانہ کے فطری بہاؤ ایکدوسرے سے ہم آہنگ ہوکر لکھنے والی کے شعور و مشاہدہ کی داد دیتے ہوئے آگے بڑھتے رہتے ہیں۔ صدیقہ بیگم اپنے افسانوں میں کبھی کبھی ماحول کی یکسانیت سے ذہن کو دور کرنے کی فکر کرتی ہیں لیکن اس تنوع یا فضا میں بھی وہ اپنے ماحول و مقصد کو نہیں بھولتیں۔ بہ ظاہر بدلے ہوئے ماحول کو بھی وہ اپنے مقصد سے قریب تر کر لیتی ہیں اس معاملے میں انکو خاص شغف معلوم ہوتا ہے۔ مناظر قدرت ہوں یا انسانی مصنوعات جب کبھی وہ ان چیزوں سے تشبیہات حاصل کرتی ہیں تو بھی اُن کی روایتی قدروں میں اُلجھ کر نہیں رہ جاتیں بلکہ انکو نئے زاوئے سے دیکھ کر اپنے افسانے کے مقصد و مواد سے ہم آہنگ کر دیتی ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے یہ فضا بھی اس واقعہ کے لئے تیار کی گئی تھی۔

پیش لفظ

بعض لوگوں کو شکایت ہے کہ صدیقہ بیگم کے افسانوں میں کبھی کبھی خشکی محسوس ہوتی ہے۔ مجھے بھی کبھی کبھی اس کا احساس ہوتا ہے۔ لیکن سوچنا یہ ہے کہ ان کا انداز بیان یا تکنیک اسکا ذمہ دار ہے یا خود موجودہ زندگی۔ ان کے افسانوں کا موضوع عموماً زندگی کی ابتری، سماج کی ستم ظریفی، حکومت کی بے راہ روی ہے۔ اس عالم میں زندگی خود اتنی بے کیف ہوگئی ہے کہ جیسے رنگینی زندگی سے گم ہوگئی ہے۔ پھر آپ ہی بتائیے کہ ایسے موضوعات میں اگر تھوڑی سی خشکی محسوس ہوتی ہے تو کیا بیجا ہے۔ بایں ہمہ اگر یہ کمی بھی نہ رہے تو اچھا ہے۔ "چاول کے دانے" "تصویر" اور "واپسی" کی خصوصیات کیوں نہ صدیقہ بیگم اپنے افسانوں کو عام طور سے عطا کردیں۔

صدیقہ بیگم کے افسانے موضوع کے لحاظ سے روزمرّہ کی زندگی سے آگے نہیں بڑھتے۔ غالباً یہ رویّہ بڑی دور اندیشی پر مبنی ہے۔ اس لئے کہ اوّل تو آئے دن کے واقعات کو سلیقہ سے پیش کرنا اپنے گرد و پیش کے حالات اور سماج کو درست کرنا ہے۔ جسکی اس وقت سب سے زیادہ ضرورت ہے اور دوسرے ابھی عام ذہنی سطح اتنی بلند نہیں ہوئی کہ بین الاقوامی واقعات و کردار سے پورا لطف و اثر حاصل کرسکے۔ اگر کوئی افسانہ نویس اس حقیقت سے چشم پوشی کرکے قلم اٹھاتا ہے تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ وہ اپنے افسانہ پڑھنے والوں سے کما حقہ' واقف نہیں اس سلسلے میں یہ بھی عرض کردینا ہے کہ صدیقہ بیگم کے افسانوں کے کردار بھی عموماً معمولی لوگ ہیں یا کم از کم غیر معمولی نہیں مگر ہر کردار اپنی جگہ پر ایک طبقہ یا جماعت ہے۔ اسکی زندگی اسکے حرکات و سکنات اُسکے محسوسات ایک فرد کی نہیں بلکہ پوری ایک جماعت کی زندگی پر حاوی ہیں۔ حامد، اطہر، شاہد، عزّالہ وغیرہ آپ کو ہر جگہ مل جائیں گے اور معلوم ہوگا کہ ہم میں سے اکثر افراد انھیں مصیبتوں میں گرفتار

ہیں۔ جن میں حامد و اطہر وغیرہ ــــــ

کردار نگاری کے سلسلے میں ایک یہ پہلو بھی قابل غور ہے کہ صدیقہ بیگم نے موقع موقع سے کرداروں کی نفسیاتی تحلیل کر کے معنویت و اثر کو پُر کار بنا دیا ہے۔ لیکن اس فن پر اتنا زور نہیں دیا کہ نفسیاتی تحلیل سے پڑھنے والا گھبرا جائے۔ بجائے افسانے کے فلسفہ پر غور کرنے میں اُلجھ جائے کاش افسانہ سننے والوں کے مذاق کا خیال بھی اسطرح ہر جگہ کیا گیا ہوتا۔ کہیں کہیں یہ بات رہ گئی ہے مثلاً 'زندگی' میں ایک بڑھیا "ننھے نادان بچوں" کو کہانی سُنا رہی ہے۔ کہتے کہتے ایک جگہ اس کے خیالات اس طرح ادا ہوتے ہیں:۔ "چاند اپنی سیمیں کرنیں ندی کے مضطرب موجوں کی طرف بڑھا رہا تھا" یہ طرز بیان 'سیمیں' اور 'مضطرب' جیسے الفاظ نادان بچوں کی سمجھ سے باہر ہیں اس کا بُرا اثر پورے افسانے کی تکنیک پر پڑتا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہانی نہیں کہی جا رہی ہے بلکہ فسانہ کہنے والا خود اپنے جذبات کا اظہار کسی ایسی محفل میں کر رہا ہے جہاں کافی پڑھے لکھے اور سمجھدار لوگ ہیں اور اس سے کہانی کا مقصد فوت ہو جاتا ہے۔ ہمیں امید ہے کہ آئندہ ان چند نقائص پر بھی فن کارانہ نظر ڈال کر صدیقہ بیگم اپنے افسانوں کو ترتیب دیں گی۔ مجموعی حیثیت سے "ہچکیاں" اپنی جملہ خصوصیات کے لحاظ سے نہ کسی سفارش کی محتاج ہے نہ کسی تعارف کی۔ وہ اپنی تمام دلکشی اور خوبیوں کی وجہ سے دعوتِ گوش و ہوش دیتے ہیں کانوں سے زیادہ کامیاب ہے۔

(ڈاکٹر) سید اعجاز حسین

۲۴ر اپریل سنہ ۵۰ء ــــــ الہ آباد یونیورسٹی

واپسی

"فریدہ بجو! ——— ادھر تو سنو تم سے کام ہے"! رشید نے آہستہ سے کہا اور کمرے کی طرف قدم بڑھائے۔ اُس کی بہن بھی کتنی سیدھی ہے۔ اتنی بڑی ہوگئی مگر پھر بھی اُس پر جان چھڑکتی ہے۔ وہ سوچنے لگا کہ بُرے وقت میں بس یہی تو کام آتی ہے۔ سچ ہے بہن کی محبت کتنی بے لوث ہوتی ہے۔ جب روپیہ کی ضرورت ہوتی ہے تو اُس کا آخری سہارا یہی ہے۔

رشید نے مسکراتے ہوئے فریدہ کی طرف دیکھا جو ابھی تک کپڑے سینے میں بدستور مشغول تھی۔ شاید اُس نے سُنا نہیں۔ اپنے بیاہ کے کپڑوں سے کتنی دلچسپی لے رہی ہے۔ کیوں نہ ہو اس کے اپنے ہی کپڑے تو ہیں دو مہینے بعد اُس کی شادی ہوجائے گی۔ مگر پھر تو بڑی مشکل ہوگی مہینہ کے آخری دنوں میں کیا ہوگا آخر یہ پانچ چھے روپیہ کتنے دن چلیں گے۔ اتنے

دن سے وہ کہتا چلا آرہا ہے مگر ہوا سے یہ نہیں ہوا کہ چار روپیہ اور بڑھا دیں۔ وہ وہیں کرسی پر بیٹھ گیا۔ ہر چیز مہنگی ہوگئی مہنگائی کا بھتہ سب کا بڑھ گیا ہے مگر اس کے روپیہ وہیں کے وہیں ایک دھیلا نہیں بڑھتا اور اس پر طرّہ یہ کہ اگر بس چلے تو اس میں سے بھی کٹ جائے وہ تو کہو وہ موقع نہیں دیتا ورنہ یہ بُوا بھلا کہیں ایک پیسہ بھی دیدیں۔

"فریدہ"۔ اُس نے دوبارہ آواز دی۔

"بھنو ذرا سننا تو کام ہے"۔

"سنتی نہیں بہری ہوگئی ——— کتنی دیر سے بھیّا بلا رہا ہے"۔

"آئی بھیّا!" ——— اس نے زور سے کہا وہ تو بھائی کے تیور ہی دیکھ کر سمجھ گئی تھی کہ ہو نہ ہو آج پھر بھیّا کو روپیہ کی ضرورت ہے اچھی مصیبت ہے۔ آخر وہ بھی روز روز روپیہ کہاں سے لائے۔ پانچ روپیہ جو انھیں ملتے ہیں وہی اُسے کبھی آخر اُسے کونسا زیادہ مل جاتا ہے بلکہ اس میں سے بھی کبھی کبھی کمی ہو جاتی ہے۔ یہ سوچتی ہوئی وہ اُٹھی اور سامنے والے کمرہ میں چلی گئی۔

"میں سمجھ گئی آج پھر عزّت خطرے میں ہوگی۔ اب میرے پاس نہیں ہے۔ ویسے بھی آج ۲۰ تاریخ ہے۔ میرے پاس جو کچھ تھا وہ ———

"سُنتی نہیں ——— اپنی کہے جاتی ہے۔ اس شادی نے تو تیرا دماغ اور بھی خراب کر رکھا ہے"۔

رشید نے کچھ ہنس کر کہا۔ فریدہ نے سر جھکا لیا۔ اُس کے چہرہ پر ایک بناوٹی غصہ آیا۔

"اچھا دیکھئے پھر وہی مذاق۔ جو کام ہو بتائیے۔ مجھے کپڑے سینے ہیں ورنہ پھر بوا بگڑیں گی۔"

"یہ کپڑے بھی میرے لئے اچھی مصیبت ہو گئے۔ جب گھر میں آؤ کپڑے سل رہے ہیں۔

اور وہ بھی معمولی نہیں بڑے قیمتی۔ بس تیرے تو ٹھاٹ ہیں ابّا اگلے ہفتہ میں آرہے ہیں

اور کچھ لا رہے ہوں گے ———— جارجٹ کی ساڑیاں، بنارسی دوپٹہ۔ بس

تو، تو بیاہ کر کے اپنے گھر ٹھاٹ کرےگی ہمیں پڑے سڑیں گے۔

"تو آپ بھی شادی کر لیجئے نا" ———— فریدہ جل کے بولی۔

"اری بھنو! ———— ہماری شادی کون کرے دیتا ہے"۔ رشید نے ایسا افسردہ

منھ بنا کر کہا کہ فریدہ کو ہنسی آگئی۔

"میں جاتی ہوں آپ تو بیکار باتیں کر رہے ہیں"۔

"ارے رے سنو تو! ———— تمھارا تو غصّہ بڑا خراب ہے اب جاؤ شادی بیاہ

کی بات نہیں کرتے کام کی بات کریں گے"۔

"ہائے اللہ تو پھر کہئے نا ———— آپ تو خواہ مخواہ کی بات کر رہے ہیں مجھے

کپڑے ————" وہ کہتے کہتے رک گئی اس کو خیال آگیا کہ پھر کہیں نہ چھیڑنے لگیں۔

"ہاں کہو کیا کہہ رہی ہو ———— کیسے کپڑے۔؟" رشید نے پھر چھیڑا۔

"اچھا بھنو! ———— شادی وادی کی بات نہیں ہوگی۔ بات یہ ہے کہ

دراصل آج بڑا اچھا کھیل آیا ہوا ہے یوں سمجھو کہ اتنی زبردست تعلیمی تصویر کبھی نہیں آئی۔

اب اس کا دیکھنا بھی کتنا ضروری ہے لیکن پیسہ پاس نہیں۔ میرے روپے کتابوں میں ختم

ہو گئے اب تم ہی بتاؤ کہ کیا کروں۔

"تو کتابوں والے پیسہ بوا سے لیجئے نا ــــــــ وہ دینگی۔"

"اجی وہ نہیں دیں گی ـــــ بیکار کہنا۔"

"ارے کہہ کے تو دیکھئے۔"

"پھر دہی مرغے کی ایک ٹانگ ـــــــ اری بھنو کہہ کے دیکھ لیا تبھی تو تم سے کہہ رہا ہوں۔ اگر بوا ایسی ہوتیں تو رونا کس بات کا تھا۔"

"تو پھر میں کیا کروں تم ہی بتاؤ کہاں سے لاؤں۔ جتنا تمھیں ملتا ہے اتنا ہی مجھے بھی۔ سوئٹر میں تھوڑا سا اون کم پڑ گیا تھا وہ میں نے منگا لیا تمھیں بتاؤ کہ پانچ روپیہ کا اون اب لڑائی کے زمانہ میں کتنا مہنگا ہو گیا ہے۔"

"بھنو یہ تو ٹھیک ہے مگر اب میں کیا کروں احمد سے غلطی سے کہہ گیا کہ آج تمھیں سینما دکھائیں گے بعد میں خیال آیا کہ پیسے تو ہیں نہیں پھر سوچا کہ جانے بھی دو بات رہ جائے گی کہ وعدہ کر کے وعدہ خلافی کی۔ ہماری فریدہ تو موجود ہی ہے"ــــــ

ــــــ بھنو جب تمھاری شادی ہو جائے گی تو بڑی مصیبت ہو جائے گی پھر کہاں سے روپیہ لاؤں گا تم سے اتنا تو سہارا ہے کہ آڑے وقت میں کام تو آ جاتی ہو۔ ورنہ بوا تو ذرا پیسہ دیں۔"

اُس نے معنی خیز نظروں سے فریدہ کی طرف دیکھا۔ سمجھ گیا کہ یہ حربہ کام آ گیا۔

"بس کل تین ہی روپیہ کی ضرورت ہے۔" اُس نے آہستہ سے کہا۔

فریدہ چونک پڑی " واہ دو آدمی میں تین روپیہ۔ خوب مجھے بیوقوف بناتے ہو۔"

" نہیں یہ بات نہیں ہے۔ میں اپنی چھوٹی سی بہن کو بیوقوف بناؤنگا؟ جو دو مہینہ کی اور مہمان ہے دیکھو جب احمد کو لیجاؤں گا تو شمیر کو بھی لیجانا ضروری ہے، ہچشموں میں بات رکھنی ہے دیکھا نہیں ابھی پچھلے ہفتہ اس غریب نے میری کتنی زوردار دعوت کی تھی۔"

فریدہ لاجواب سی ہوگئی۔ آہستہ آہستہ اُس نے قدم بڑھائے تین روپیہ کے لئے بھیّا کو ناراض کردینا بڑی بُری بات ہے۔ پھر کہیں روز روز تھوڑا ہی یہاں آؤں گی معلوم نہیں کہاں ہوں کہاں نہیں وہ آہستہ آہستہ اپنے صندوق کے پاس پہنچ گئی۔۔۔

" اچھا آپ وہیں رہیئے۔" اس نے بیٹھتے ہوئے کہا۔

" کوئی میں تمھارے روپیہ تھوڑا ہی چھین لوں گا۔ بڑی ہوشیار ہوتی جارہی ہے اب تو تو۔۔۔۔۔۔۔۔کیوں نہ ہو سہیل بھائی کے روپیہ رکھے گی نا۔"

" پھر وہی مذاق۔۔۔۔۔۔۔۔اچھا جلئیے نہیں دیتی۔۔ لے لیجئے اب اگر ایک پیسہ بھی دوں۔"

" اچھا لاؤ اب نہیں کہتے دیر ہورہی ہے مجھے کپڑے بدلنے ہیں۔"

فریدہ نے تین روپیہ کے تین نوٹ نکال کر رشید کو دیدئے۔ اُس نے فوراً لے کر جیب میں رکھ لئے۔

" میری بھنّو کتنی اچھی ہے۔ میں جانتا تھا کہ فریدہ مجھے کبھی ناامید نہ کریگی۔ میری بھنّو"

——— " اُس نے آہستہ سے کہا اور جھپٹ کر دروازے سے باہر نکل گیا۔ بس اب ٹھیک ہے۔ ایک روپیہ گیارہ آنے کے ٹکٹ ——— پانچ آنے کی سگریٹ اور ایک روپیہ جیب میں ——— اُس نے دل ہی دل میں حساب لگایا بس اب تو احمد کو دعوت دے ہی دوں۔ احمد کی کوٹھی پاس ہی تھی۔ اس کی کوٹھی بھی کتنی خوبصورت ہے ظالم ٹھاٹ کرتا ہے اور اسکا مکان ——— بس اس کا تو ذکر ہی فضول ہے۔ ابّا جان دو سو پا رہے ہیں لیکن یہ نہ ہوا کہ سلیقہ کا ایک مکان ہی بنا ڈالتے اب تو خیر گرانی کا نام ہے پہلے جب گرانی نہیں تھی تب ہی کیا کر لیا ——— پیسہ نہ ہونا بھی واللہ کتنی بڑی مصیبت ہے احمد کو دیکھو کبھی اس کے پاس روپیہ کی کمی نہیں پڑتی ہر وقت جیب بھری رہتی ہے اور یہاں دیکھو تو تین روپے کے لئے فریدہ کی خوشامد کر رہے ہیں۔ پھر احمد اکثر اس کی دعوت بھی کرتا رہتا ہے اچھے سے اچھے کھانے میز پہ لگے رہتے ہیں اور یہاں تو دو ایک سال میں ایک مرتبہ کہیں دعوت کرنے کی توفیق ہوتی ہے اور اس پہ جتنا بھی سُننا پڑتا ہے کم ہے ——— اُس کو غصّہ آنے لگا۔ اتنے میں احمد کی کوٹھی آگئی اُس نے فوراً نوکر سے احمد کو بلانے کو کہا اور باہر رکھی ہوئی کرسی پہ بیٹھ گیا ——— دس پندرہ منٹ بعد احمد اندر سے آیا۔

"کیوں اُستاد کیسے آئے"؟

"اماں یار چلو تان سین دیکھتے آئیں۔ گانے غضب کے ہیں اور پھر خورشید بھی تو ہے"!

"کونسا شو"

"پہلا والا جو ساڑھے سات سے ہوتا ہے۔ چھ بج گئے زرا جلدی چلنا چاہئے۔"

"اچھا تو طے۔ میں بھی سوچ رہا تھا کہ آج کیا کرنا چاہئے۔"

"تو پھر میں ذرا ضمیر سے بھی لگے ہاتھوں کہتا آؤں۔"

"اچھا جاؤ" ——

"مگر یار دیر بہت ہوگئی مجھے زرا نہانا بھی ہے اس واسطے ایسا کرو کہ تم اپنے نوکر کو بھیج دو۔"

"اچھا تو —— تم جاؤ تیار ہوکر آؤ۔ میں نوکر کو ابھی بھیج دیتا ہوں۔ لیکن دیر مت کرنا۔"

رشید دوڑتا ہوا گھر پہنچا وہ اس سوچ میں تھا کہ کیا پہنے —— بادامی سوٹ —— بے دیکھ ایک ہی تو ہے اور وہ اُسے کئی مرتبہ پہن چکا تھا روز بروز ایک ہی کپڑا پہنتے ہوئے اچھا بھی تو نہیں معلوم ہوتا۔ اُس کی نظر فریدہ کے اونی جمپر پر پڑی جس کا ڈیزائن اُسے بیحد پسند تھا۔ لڑکیوں کے بھی مزے ہی ہیں اور یہاں ایک سوٹ سے دوسرا ہونے کا نام ہی نہیں لیتا۔ جب کہو کہ ایک گرم سوٹ بنوا دو تو جواب ملتا ہے کہ "ایک ہے تو ابھی کیا ضرورت ہے۔" جیسے پچاسوں بھرے پڑے ہیں۔ بھلا یہ بھی کوئی بات ہوئی۔ احمد نے سرج کا کتنا اچھا سوٹ ابھی پرسوں ہی بنوایا ہے۔ اور پھر اُس کے ابّا پوچھ رہے تھے کہ اور تو ضرورت نہیں، حالانکہ اس کے پاس بارہ سے تو کم نہ ہوں گے خیر اب اسوقت کیا کیا جائے یہ خیال اُسے پریشان کر رہا تھا۔ سینما نہ جاتا تو اچھا تھا مگر اب جائے تو کیا پہنکر

"اس کا غصہ بڑھتا جارہا تھا اس نے چوڑی دار پاجامہ اور ایک قمیض بنگالی بنیائن بھی تو ے دیکر آ اُدھڑ رہ گئے تھے خیر یونہی سہی۔ آج اپنی پُرانی شیروانی پہن کر جائیگا۔ وہ چارپائی پر کپڑوں کے پاس لیٹ گیا۔ اس کا دماغ کام نہیں کر رہا تھا اس کو یہ نہیں معلوم تھا کہ اب کیا سوچے فریدہ کپڑوں کا ایک بنڈل لئے ہوئے وہاں رکھنے آئی۔

"بھیا!"——اس نے کہا——"یہاں کیسے پڑے ہو کچھ طبیعت خراب ہے۔"

"نہیں تو۔" یہ کہہ کر وہ اُٹھا اور غسل خانہ میں کپڑے لیکر چلا گیا۔

آدھے گھنٹے بعد وہ تیار ہو کر نکلا اور آئینہ کے سامنے کھڑے ہو کر بال سنوارنے لگا۔ باہر سے بُوا کے چلانے کی آواز آرہی تھی۔ "آج معلوم ہوتا ہے نواب صاحب نے پھر کہیں جانے کی تیاری کرلی ہے۔ اس لونڈے نے بھی اچھی مصیبت کردی ہے گھر پہ تو بیٹھنا جانتا ہی نہیں۔ یہ نہیں گھڑی دو گھڑی کو بیٹھ کے پڑھے۔ اب امتحان ہونے والا ہے پاس کیا خاک ہوں گے۔" اُس نے ایک ایک لفظ سُن لیا تھا اب اُن کے ساتھ سر مغزنی کرنی تھی۔ تین چار گھنٹے کو گھر سے باہر نہیں جاسکتے بات بات پر جواب دہ ہونا پڑتا ہے اب کوئی آدھا گھنٹہ خراب کرے تو کہیں جاکر سینما جانے کی اجازت ملے گی ہاں اگر روپیہ ملنے کی بات ہو تو پھر یہ بھی سہی مگر یہاں سو یہ امید آسماں سے نہیں——اُس نے کنگھا جیب میں رکھا اور کمرے سے باہر نکلا تھا کہ بُوا چلائیں۔

"کہاں چل دے بن ٹھن کے——میں کہتی ہوں آخر کس دن تجھے ہوش آئے گا۔ ذرا بھی گھر کی پرواہ نہیں——

"گھر کو کیا کروں۔ کوئی بھاڑ میں جھونکوں۔"

"ہاں اور کیا ——— تیرا بس چلے ——— تو گھر بار ماں بہن سب ہی کو آگ میں جُھونک دے۔"

"اچھا خیر یہ جھک جھک ختم کیجئے ——— میں سینما جا رہا ہوں۔"

"پھر وہی روز روز سینما۔ کوئی حد بھی تو ہو کھانے کو ملتا نہیں اور یہ منگیا سینما تھیٹر ختم ہونے کا نام نہیں لیتے۔ اب بھی سنبھل جاؤ نہیں تو پچھتاؤ گے بڑوں کا کہا اور آنولے کا کھایا بعد ہی میں پتہ چلتا ہے۔"

رشید غصہ میں باہر نکل گیا۔ بوا برابر بڑبڑا رہی تھیں "کچھ سمجھ میں نہیں آتا کہ اس لونڈے کو کیا ہوگیا ——— کہنا مانتا نہیں گھر میں کھانے کو نہیں اور اسکو ہری ہری سوجھتی ہے۔"

رشید دور چلا گیا تھا بوا کی آواز سنائی تو نہیں دے رہی تھی البتہ اس کے کانوں میں ابھی تک گونج رہی تھی۔ یہ بھی سٹھیا گئیں۔ احمد کے پاس مت بیٹھو بڑے آدمی ہیں۔ سینما مت دیکھو ——— بس اُن کے لئے دن رات پڑھو چاہے اپنی تندرستی خراب ہوجائے۔ ایک دن تو خوشی سے نہیں کہا کہ لے بیٹا جا سینما دیکھ آ ——— ویسے تو بڑی محبت آتی ہے۔ اُن کی محبت سے تو بس خدا ہی بچائے۔

اس نے دیکھا احمد سامنے نیلا سُوٹ پہنے کھڑا ہے ——— نیلا سوٹ ——— یہ تو کوئی نیا معلوم ہوتا ہے میں نے اُسے نہیں دیکھا۔ چالیس روپیہ گز سے کم تو نہ ہوگا۔ یہاں زندگی بھر میسّر نہیں ——— واللہ ٹھاٹ کرتا ہے۔

"کیوں رشید! تان سین ہے یا کوئی اور ـــــــ ورنہ ساری محنت رائیگاں جائے گی ـــــــ اماں ضمیر گھر پر ہوگا ہی نہیں، چلو۔ سینما چلیں۔"

دس کا گھنٹہ بجے دیر ہوگئی اب تو آہی رہے ہوں گے بھیا بھی عجیب لاپرواہ ہیں جب دیکھو ہمیشہ ایسے ہی آتے ہیں بھلی دوستی ہوئی۔ مگر اب اُن سے کہے کون جسے ڈانٹ کھانی ہو بوا بگڑتے بگڑتے تھک گئیں، مگر وہ کہاں سنتے ہیں ـــــــ احمد کا تو دن بھر کا وظیفہ ہو گیا ہے۔ فریدہ کو غصہ آنے لگا، بوا بھی اپنے بستر پر آرام کر رہی تھیں، بچے تو شام ہی سے سو گئے اور یہ کوئی وقت بھی ہے جاگنے کا۔

جاڑے کی راتیں، وہ بھی کہاں تک انتظار کرے گی، اُدھا بھی تو بج گیا مگر بھیا! ـــــــ وہ اپنے بستر پر لیٹ گئی۔ بوا کا ڈر تھا ورنہ وہ تو کبھی کی سو جاتی جب آئیں گے تو ڈانٹ پڑے گی کہ اتنی رات گئے گھر میں آتے ہو اور نیند ایسی آرہی تھی کہ پیچھا نہیں چھوڑتی۔ اس نے اٹھ کر پانی سے مُنہ دھویا ـــــــ اگر اس وقت چائے پی جاتی تو اس سے نیند اُڑ جاتی مگر سماوار کی آواز ـــــــ اس سے یہ آواز جو نکلتی ہے یہ اور مصیبت ہے۔ بوا کی آنکھ نہ کھلتی ہوئی بھی کُھل جائے گی۔ بوا بھی تو ہر جگہ پابندی لگاتی ہیں۔ جب دیکھو ڈانٹ ـــــــ اسی سے تو بھیا بھی بگڑتے ہیں لیکن زیادتی تو وہ بھی کرتے ہیں اب کھیل نہ جانے کب کا ختم ہو چکا ہوگا ـــــــ تعلیمی فلم ـــــــ اُس کو ہنسی آئی۔ کیا بہانا بناتے ہیں۔ جب دیکھو کوئی نہ کوئی تعلیمی تصویر آرہی ہے بھیا تو

یہ کہتے ہیں اور ادھر آبا کہہ رہے تھے کہ ہندستان میں تعلیمی تصویریں بنتی ہی نہیں ——

بڑا بہانہ کرتے ہیں یہ بھیّا —— اُس کی نیند کچھ کم ہوگئی تھی۔ چائے بنائے یا نہ بنائے

جانے بھی دو خواہ مخواہ کو بوا ڈانٹے گی۔ وہ اپنے سینے کے کپڑوں کی پٹلیا اُٹھا لائی اور

اس نے سینا شروع کر دیا اب اُس کی گھبراہٹ کم ہوگئی تھی۔ تھوڑے دن بعد اُس کی

شادی ہو جائے گی۔ سینما تو وہ بھی دیکھتے ہوں گے اُن کا بھی وہ انتظار کیا کرے گی۔ اُس

کو اب سوچنے میں لطف آنے لگا تھا۔ لیکن پھر تو وہ خود بھی سینما جایا کرے گی۔ اُسے تو وہ

ضرور دکھائیں گے .... —— بڑا مزا آئے گا پھر تو خوب

اچھا رہیگا۔ سینما کا پردہ اُس کی آنکھوں کے سامنے آگیا۔ اُس کے ہات میں سوئی بڑے

مزے میں چل رہی تھی۔ سینما کا پردہ —— اور تصویر —— وہ آہستہ آہستہ

مسکرا رہی تھی پھر کچھ سوچ کر جھینپ گئی۔ نیند غائب ہو چکی تھی اس نے کپڑے میں

سوئی لگا کر رکھدی اور اچھل کر تکیہ میں منہ چھپا کر پڑ گئی۔ وہ بھی کیسی کیسی باتیں سوچنے

لگتی ہے۔ مگر سب ہی لڑکیاں ایسا سوچتی ہونگی۔ مگر بنتی کیسی ہیں جیسے کوئی خوشی ہی

نہیں ہے۔ دل میں چاہے لڈو پھوٹتے ہوں اور کوئی پوچھے تو منہ چھپا لیتی ہیں اُس

نے تکیہ میں سے سر نکالا اور پھر کپڑا اُٹھا کر سینے لگی کتنی دیر ہوگئی ابھی تک بھیّا نہیں

آئے۔ وہ اتنا کپڑا ابھی تو سی چکی۔ کہیں بیٹھے گپ ہانک رہے ہونگے۔ اُن کو کیا فکر۔

—— چارپائی کی چول چڑچڑ ہوئی۔ وہ گھبرا گئی بوا ابھی تک جاگ رہی ہیں ——

نہیں سو گئی ہوں گی۔ وہ کچھ مطمئن ہوگئی۔ کروٹ لی ہوگی۔

"بیٹی ابھی سوئی نہیں کیا کر رہی ہے۔ کتنی رات ہوگئی ——— بھیّا آگیا؟"

آخری دو لفظ نہ کہتیں تو وہ جواب بھی دیتی مگر اب کیا جواب دے وہ گھبرا گئی تھی جھوٹ بولے ——— کہیں ادھر نہ آجائیں کبھی ڈانٹنے کے لئے ہی آئیں۔ سچ بولے تو بھی مشکل ہے بگڑیں گی کہ اتنی رات گئے کیوں نہیں آیا ——— جھوٹ بولے ——— سچ بولے ——— ہائے اللہ کیا کرے۔ یہ تمام خیالات یک وقت اُس کے دماغ میں آرہے تھے۔ وہ کوئی فیصلہ نہ کرسکی آخر کیا جواب دے۔ لیکن فوراً کسی خیال نے اُسے مطمئن کردیا۔

"ابھی تو نہیں سوئی۔ ابھی بجا ہی کیا ہے ۹ بجے ہیں۔ اندھیری رات ہے اس واسطے معلوم ہو رہا ہے کہ جیسے ۱۱ بج رہے ہیں۔" گیارہ اُس کی زبان سے بے ساختہ نکل گیا۔ وہ پریشان ہوگئی کہ اُس نے یہ کیوں کہہ دیا خیر جانے بھی دو ——— بوا کچھ بڑبڑا رہی تھیں۔ اُس نے سُنا نہیں۔ لیکن سمجھ تو گئی کہ کیا کہہ رہی ہیں اور اس کا قیاس صحیح بھی تھا۔ صبح سے انھیں غصّہ آرہا تھا اور پھر بھیّا بغیر اجازت کے چلے گئے۔ ابھی بھیّا نہ آئیں تو اچھا ہے۔ بوا سو جاتیں تو ٹھیک تھا۔ اور اسی لئے اُس نے کچھ کہا نہیں کہ اچھا ہے بڑبڑاتے بڑبڑاتے سو جائیں ——— وہ خاموش رہی اور برابر اپنا کام کرتی رہی ——— کوئی پندرہ منٹ ہوگئے۔ اب تو بوا سو گئی ہوں گی۔ بڈھے آدمیوں کو نیند کیوں نہیں آتی "جوانوں" ——— اُس کے دماغ میں آہی گیا۔ لیکن وہ شرما گئی۔ آخر اس میں کونسی بات ہے بوا دن بھر میں پچیس مرتبہ تو کہتی ہوں گی اور وہ

00388NS

سوچنے سے شرماتی ہے۔ اب اس کو اپنے آپ ہی سے شرم آرہی تھی۔

کھٹ۔ کھٹ ——— "فریدہ!"

"آگئے بھیّا" ——— اُس نے آہستہ سے کہا اور ننگے پیروں اُٹھی، تاکہ پیر سے آواز نہ نکلے وہ آہستہ آہستہ چلی۔

کھٹ ——— کھٹ ——— "فریدہ سوگئی کیا؟"

کھٹ ——— کھٹ ———

"اچھّا" ——— اُس نے آہستہ سے کہا اور وہ گھبرائی۔ کھٹکھٹائے جا رہے ہیں۔ مانتے ہی نہیں بوا جاگ جائیں تو اسکا کیا ہے اُن کی اپنے آپ مصیبت آئے گی۔ اُس نے دروازہ کھول دیا۔ آہستہ سے چلے آئے بُوا کی آنکھ کھُل گئی تو وہ بگڑیں گی کہاں رہ گئے تھے اتنی دیر ہوگئی۔

رشید بغیر کچھ جواب دئے اپنے بستر پہ آکر بیٹھ گیا اور جوتے اُتارنے لگا۔ فریدہ باورچی خانے میں گئی کھانا ٹھنڈا ہوچکا تھا اس نے انگیٹھی میں کچھ کوئلہ ڈال کے دہکائے تب کہیں جاکے کھانا گرم کرنے کو رکھا۔ وہ آہستہ آہستہ برتن اُٹھا رہی تھی۔ کہیں بُوا کی آنکھ نہ کھُل جائے۔ سالن بھی چھن چھن ہوتا تو اُسے ڈر معلوم ہوتا کہ اب بُوا نے منہ کھول کر دیکھا اور چلّائیں معلوم نہیں ان بڑی بوڑھیوں کو اس قدر غصّہ کیوں آتا ہے زرا سی بات ہوئی اور سارا گھر سر پہ اُٹھا لیا۔ مگر یہ بات تو ہے بھی غصّہ کی آدھی رات گھر سے غائب رہنا کھانا رکھا ہوا ٹھنڈا ہورہا ہے وہ نہ ہوں تو بھیّا کو

پتہ چلے۔ وہ سوچتے سوچتے چونک پڑی ——— وہ نہ ہو تو! ——— آخر وہ کہاں چلی جائے گی۔ ہاں اب اس کی شادی ہو جائے گی سسرال ——— وہ خود ہی خود جھینپ گئی ——— وہ بھی کیسی عجیب عجیب باتیں سوچنے لگتی ہے۔ اُس نے آہستہ آہستہ کفگیر سے دیگچی کو چلایا ——— اور بار بار باہر کو جھانک کر دیکھا۔ برآمدے میں بوا سو رہی ہیں کہیں برتنوں کی آواز نہ سُن لیں ——— بُوا کے تو کان لگے رہتے ہیں جہاں برتن کی آواز ہوئی اور وہ چلّائیں۔

"کون ہے؟" ——— فریدہ کے ہاتھ سے کفگیر چھوٹ گیا اور دیگچی کے کنارے سے لگتا ہوا زمین پر آ رہا ——— "غضب ہوگیا" فریدہ کے مُنہ سے نکلا۔

"فریدہ؟ ——— او فریدہ؟ دیکھیو بلّی نے دودھ کھول دیا کہیں سب چٹ نہ کر جائے"

اب فریدہ بولے تو کیا بولے ——— بس اب آفت آئی وہ چپکی رہی بُوا پھر گرجیں۔

"ایسی بھی کیا نیند، میں چلّا رہی ہوں۔ چور بھی سارا گھر اُٹھا کے لیجاویں تو بھی انھیں پتہ نہ چلے"

اب بوا خود ہی بستر سے نکل پڑیں اور ننگے پیروں باورچی خانے کی طرف دوڑیں خاموش رہے تو اب اور بھی ڈانٹ پڑے گی۔

"کیا ہے بوا جی!" ——— فریدہ نے بڑے پیار سے کہا۔ بُوا کچھ ٹھنڈی سی پڑیں۔

"توبہ ہے فریدہ اس وقت یہاں کیا کر رہی ہے؟" انگیٹھی کی طرف جو دیکھا تو آگ دہک رہی تھی تو ان کے تن بدن میں بس آگ ہی تو لگ گئی۔ انھیں یاد آگیا کہ رشید سینما دیکھنے گیا تھا اب واپس آیا ہوگا۔

"کھانا گرم ہو رہا ہوگا۔ نواب صاحب اس وقت تشریف لائے ہیں ——— ہوں"———

وہ خود ہی خود بڑبڑائیں۔ فریدہ اطمینان سے اب کھانا گرم کرنے لگی۔ بوا کو اب خبر تو ہو ہی گئی اب اور کس کا ڈر ہے۔

"مجھے تو اس اولاد نے کھا لیا ہے۔ دن بھر کام کرتے کرتے تھک کے چور ہو جاتی ہوں اور رات کو بھی پڑنے کی چین نہیں نہ جانے کیسی اولادیں ہوتی ہوں گی جو ماں باوا کو سکھ پہنچاتی ہوں گی۔" وہ بڑبڑاتی ہوئی اپنے بستر میں جا کے لیٹ گئیں۔ فریدہ بھی کھانا لیکر کمرہ میں چلی گئی۔

"بارہ ایک بجے گھر میں آکے گھستے ہیں اور پھر دس بجے دن تک کہیں سو کے اٹھتے ہیں۔ جبھی تو گھر میں نحوست برس رہی ہے۔" وہ بستر میں لیٹی لیٹی بڑبڑا رہی تھیں روز سینما یہ فرنگیوں کے ڈھنگ لئے ہیں۔ نہ اللہ کا نام نہ رسول کا۔" رشید اور فریدہ خاموش تھے۔ جیسے سانپ سونگھ گیا ہو۔ وہ بڑبڑاتی بڑبڑاتی سو گئیں جب رشید کی کہیں جان میں جان آئی۔

"فلم دیکھ آئے۔ فریدہ نے کپڑے میں سے سوئی نکالتے ہوئے پوچھا۔

"ہاں بہت اچھی تعلیمی فلم تھی۔" اور پھر اس طرح ہنس کر فریدہ کی طرف دیکھا جیسے اس کا شکریہ ادا کر رہا ہو۔ اور سچ بھی تھا اگر وہ روپیہ نہ دیتی تو ضرور فلم دیکھتے بوا تو پھوٹی کوڑی بھی دینے والی نہیں تھیں اور ڈانٹ بتاتیں الگ سے۔

"احمد آج نیلا سوٹ پہن رہا تھا۔ بڑا قیمتی کپڑا ہے۔" آج اس کے ذہن میں ہر پھر کے وہی سوٹ گھوم رہا تھا کتنا خوبصورت تھا وہ سوٹ۔

"نیلا سوٹ؟"

"ہوں"

فریدہ نے ایسے جواب دیا جیسے کوئی بات ہی نہیں اور اس کے لئے بات ہی کیا ہوسکتی تھی جو روز اپنی شادی کے نئے نئے جوڑے سیتی ہے۔ نیلے، پیلے، معلوم نہیں کن کن رنگوں کے ایک سے ایک بڑھیا۔ قسمت تو اسکی خراب ہے۔ سال دو سال میں کبھی ایک شیروانی بن جاتی ہے چلو چھٹی ہوئی۔

"لو اٹھاؤ" ——— رشید نے کھانا بھی تھوڑا ہی کھایا تھا کچھ بھوک نہ تھی اور پھر بوا کی جھک جھک نے اور بھوک غائب کردی۔ فریدہ کپڑے میں سوئی لگا کر کھڑی ہوگئی۔

"او ——— بارہ بج گئے" ——— اُس نے گھڑی کی طرف دیکھا "فریدہ اب تم بھی سو جاؤ۔"

"اور نہیں تو کیا رات بھر پہرہ دوں گی۔" وہ جل کے کوئلہ ہوگئی۔

رشید رضائی میں منہ ڈھانپ کے سوگیا اور فریدہ بھی روشنی بجھا کے اپنے بستر میں جا لیٹی۔

رشید کو نیند نہ آئی۔ اس کو بھی ہمیشہ کوئی نہ کوئی پریشانی رہتی ہے آخر یہ پریشانیاں سب اسی کے لئے کیوں رہ گئی ہیں۔ دنیا میں کوئی اور ہے ہی نہیں۔ ویسے تو وہ قسمت کا قائل نہ تھا مگر آج نہ جانے کیوں رہ رہ کر وہ اپنی قسمت پر افسوس کر رہا تھا۔ یہ الفاظ غیر ارادی طور پر اس کے ذہن میں آئے۔ "اس کی قسمت بھی کیسی ہے" ——— ہمیشہ تو وہ مالی پریشانیوں میں مبتلا رہتا ہے۔ روپیہ پیسے کی کمی اُس کے لئے ہمیشہ ہی ایک مصیبت رہتی ہے۔ آج کو تو فریدہ نے ساتھ دیدیا اب وہ بھی کہاں تک اس کی مدد کریگی۔ پھر اُس کی بھی شادی ہوجائے گی۔ آج اس کو ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ روپیہ انسانی زندگی کی باگ ڈور تھامتا ہے۔ روپیہ ہی زندگی کے ہر شعبہ پر حاوی ہے ——— کتنی رات ہوگئی اب اُسے سونا چاہئے صبح جلد اُٹھنا ہے۔ مگر صبح کو کیا ہوگا۔ احمد کی دوستی بھی اسکے لئے بھاری ہوگئی۔ بھر پائے ایسی دوستی سے ——— مگر اب تو نباہنا ہی پڑے گا۔ بڑے آدمیوں کی دوستی ایسی ہی ہوتی ہے مگر یہ تو اس کی ہی غلطی ہے۔ وہ جانتا ہے کہ اس کی والدہ کتنی سختی برتتی ہیں ——— چار پیسہ دینا نہیں چاہتیں۔ ان باتوں کے باوجود اس نے دعوت دیدی آخر ایسا کونسا موقع تھا جو خواہ مخواہ کو اپنے گلے ہیں اس نے یہ مصیبت

ڈالی۔ مگر مجبوری بھی تو تھی۔ اُس نے کتنی مرتبہ اُس کی دعوت کی ہے اور کیسی کیسی چیزیں کھلائیں اس نے تو کبھی اس کو جھوٹے کو بھی نہیں پوچھا ــــــ لیکن آخر وہ پیسہ والا ہے اپنی حیثیت بھی تو دیکھنی چاہیئے۔ اُسے ایک دم سے کچھ یاد آیا اور وہ ہنس پڑا ــــــ بچپن میں اس نے کاہلی اور چستی کا مقدمہ پڑھا تھا اس وقت وہ اس کو دوسرے معاملہ میں دہرا رہا تھا۔ خود ہی ایک بات کہتا اور پھر خود ہی اس کو کاٹنے کی فکر میں کوئی دوسری دلیل پیش کرتا تھا۔ فریدہ کی آنکھ لگتی آرہی تھی۔ وہ اس بے موقع ہنسی سے جاگ اُٹھی۔

"کیا ہے بھیّا! ــــــ کیوں ہنس رہے ہو"۔

"گویا ہمارے ہنسنے پر بھی پابندی ہے"!

"آپ بھی کیسی بات کرتے ہیں پابندی کون لگاتا ہے لیکن آخر یہ آدھی رات گئے ہنسنے کا کون سا وقت ہے"!

رشید کچھ لاجواب ہوگیا۔ کمرہ میں دوبارہ خاموشی چھاگئی۔ رشید بھی سوگیا تھا۔

× × × × ×

اگلے روز صبح صبح رشید خلاف معمول جاگ گیا آج اس کو بوا کو راضی کرنا تھا۔ کاش وہ دعوت میں روڑا نہ اٹکاتیں اب کوئی روز روز تو وہ دعوت کرنے جا نہیں رہا ہے پھر بعد میں امتحان قریب ہے کون اب کسی کی دعوت کریگا۔

اس نے دعوت دے تو دی مگر اب بوا سے کہا جائے تو کس طرح وہ تو دور سے دور ہی کھانے کو دوڑتی ہیں۔

"فریدہ؟" ــــــــــ اُس نے کتاب پڑھتے پڑھتے کہا۔ "کیا کر رہی ہو؟ سی رہی ہو؟"

"ہاں" فریدہ نے مقیش پر نظریں گاڑے گاڑے جواب دیا۔ وہ دوپٹہ کے پلوؤں پر مقیش ٹانک رہی تھی۔

"یہاں آنا بھنّو! کام ہے!"

"کیا کام ہے" ــــــ وہ بولی۔

"بڑا ضروری کام ہے ــــــ بس تم ہی کر سکتی ہو" رشید یہ کہکر ہنس پڑا اور فریدہ کچھ جھنجھلا سی گئی۔ ہوگا کام۔ پھر روپیہ کی ضرورت پڑی ہوگی اُس کے پاس اب روپیہ دوپیہ نہیں ہے۔ تین نفے وہی کل دیدئے یہ بھی تو خیال کرتے کہ اس کا دل بھی کسی چیز کو چاہتا ہوگا ایک تو کچھ لانے سے گئے اور ــــــ" وہ دل ہی دل میں بڑبڑا رہی تھی۔

"فریدہ بھنّو! ــــــ اپنے بھیا کی بات بھی سن لیا کرو" اُس نے ایسی محبت اور خوشامد سے کہا کہ فریدہ کو رحم سا آگیا اور وہ پلّو میں سوئی لگا کر کھڑی ہوگئی۔

"کیا ہے؟" فریدہ کو ہنسی آگئی۔

"بڑا ضروری کام ہے میری بھنو ——— بس میری عزت کا سوال ہے۔"

"روز روز میں روپیہ کہاں سے لاؤں۔ آپ نے تو قارون کے خزانے کا مالک مجھ ہی کو سمجھ لیا ہے۔"

رشید ہنس پڑا ——— "اسے ہر وقت روپیہ ہی کا خیال رہتا ہے" بھنو روپیہ نہیں چاہئے۔"

"پھر اور کیا کام ہے۔" فریدہ نے ایسے کہا جیسے "روپیہ کے علاوہ رشید کا کوئی کام ہی نہیں کر سکتی۔

"کہاں گئی فریدہ؟" بوا باہر سے چلائیں "سارا دن اسی طرح ختم ہو جاتا ہے ایک کپڑا ابھی تو سل کر نہیں تیار ہوتا۔"

"اچھی مصیبت میں جان ہے۔ سارے دن سیتے سیتے آنکھیں بھی ترجاتی ہیں مگر یہ بگڑتی ہی رہتی ہیں۔"

"جاؤ بھئی تمھاری شادی کے کپڑے ہیں سیو ——— مت کرو ہمارا کام۔"

"آپ کام تو بتاتے نہیں۔ میں کرنے کو کب منع کرتی ہوں۔"

"بات یہ ہے بہن۔ احمد کئی دن سے سر ہو رہا تھا کہ چائے کی دعوت دو ——— اب منع بھی کس طرح کرتا۔ بیسیوں دفعہ وہ میری دعوت کر چکا ہے۔"

"ہاں تو یہ کہئے کہ آپ دعوت کر آئے۔" فریدہ ہنسی جیسے اس پر طنز کر رہی ہو۔" اب ڈانٹ بھی تو خوب کھانی پڑے گی کوئی یہ تو ہے نہیں کہ چپکے سے روپیہ نکال کر دیدوں اور بوا کو خبر نہ ہو۔"

"تو پھر کیا ہوگا بہن۔" رشید نے خوشامد کی۔"کسی طرح بوا کو راضی کرو دیکھو چار بجے احمد آئے گا اگر چائے ناشتہ نہ تیار ہوا تو بڑی شرمندگی ہوگی اور پھر عمر بھر اُسے منھ نہیں دکھا سکوں گا۔"

فریدہ اکڑی جیسے ساری دنیا کا نظام اسی کے ہات میں تو ہے۔ دنیا کا ہو یا نہ ہو رشید کا تو ہے ہی۔ وہ چاہے تو ذرا سی دیر میں درہم برہم کر دے۔

"اری فریدہ!" بوا باہر سے چلّائیں۔..............

......."کہاں چلی گئی"!

"آرہی ہوں۔" فریدہ نے جل کے جواب دیا۔

"تو پھنو کر دوگی ہمارا کام۔ دیکھو پھر ہم تم سے کسی کام کو نہیں کہیں گے اور ایک مہینہ بعد تو تم خود ہی اپنی سسرال چلی جاؤگی۔ پھر تم کہاں ہوگی ہم کہاں ہوں گے۔ کون تم سے کام کرانے کے لئے جایا کرے گا۔"

"دیکھئے پھر وہی مذاق۔ جائیے میں بھی آپ کا کوئی کام جو کرکے دوں۔"

"نہیں ——— نہیں ——— میری اچھی سی چھوٹی سی بہن ——
—— ناراض ہوگئی کیا۔ اچھا جاؤ بوا کو راضی کردو ———
انام دونگا ——— بڑا اچھا انعام"

وہ ہنس پڑی:۔ "اچھا اچھا کہدوں گی" جیسے وہ پہلے مذاق میں روٹھ گئی تھی۔ بیاہ کے نام سے تو اور اُس کے دل میں گُدگُدی سی ہونے لگی، شادی، سسرال، نہ جانے کیوں بار بار اُس کے ذہن پر چھانے لگتے اُوفو ——— وہ سوچتے سوچتے تھک سی جاتی۔ ہرچند وہ سوچنا نہیں چاہتی تھی مگر ہر وقت تو گھر میں شادی کا ذکر رہتا تھا آخر وہ بھولے بھی کس طرح اُس کے دل میں ایک عجیب طرح کی گدگداہٹ محسوس ہوتی اور پھر وہ خود ہی خود شرما جاتی۔

شام ہوئی کسی نہ کسی طرح بُوا کو راضی کرہی لیا اور فریدہ نے تو کچھ ایسی پٹّی پڑھائی کہ بوا خود بھی چیزیں پکانے میں مدد دے رہی تھیں۔

"جلدی جلدی پھرتی سے کام کرو بیٹی چار بجے چاہتے ہیں" اور دونوں ماں بیٹیوں کے ہات چرخی کی طرح چل رہے تھے۔ بڈھے ماں باپ کو چلانے میں بھی لڑکیوں کو کمال حاصل ہوتا ہے کتنی چالاک ہوتی ہیں یہ لڑکیاں۔ رشید تو دل ہی دل میں اس کا قائل ہوچکا تھا اسی لئے تو جب بوا کو راضی کرنا ہوتا تو وہ فریدہ سے کام نکالتا۔ وہ کسی نہ کسی طرح ان کے غصہ

کو ٹھنڈا کر ہی لیتی تھی۔

"چائے تیار ہو گئی بھنّو؟" رشید نے فاتحانہ انداز میں آ کے پوچھا بوا اب بگڑیں بھی تو کیا اس کا کام تو ہو ہی گیا۔ اور وہ بگڑتیں کب نہیں مگر جب اپنا کام ہو جاتا ہے تو پھر چلّاتی رہیں۔

"ہاں سب چیزیں تیار ہیں —— کس کمرہ میں رکھوں۔ میں نے تو برابر والے کمرہ میں میز لگا دی ہے۔ جس کا دروازہ باہر کو کھلتا ہے۔"

"ہاں —— ہاں —— بس ٹھیک ہے تم تو خود ہی سمجھ دار ہو بس ذرا جلدی کرنا کیونکہ مجھے پانچ بجے کی ٹرین سے جانا ہے۔" رشید یہ کہہ کر باہر چلا گیا۔ اور بوا کے تو جیسے تن بدن میں آگ لگ گئی ہو۔ وہ کڑاہی چولھے پر سے اُتار رہی تھیں غصہ میں اس زور سے زمین پر رکھی کہ تیل گرتے گرتے بچا۔

"پانچ والی گاڑی سے کہاں جا رہا ہے یہ؟" بوا غصہ سے بولیں۔ فریدہ بچاری جواب دیتی تو کیا یہ تو اسے بھی معلوم نہیں تھا۔ ابھی طے کیا ہوگا۔

"اس لونڈے نے بھی مجھے کھا لیا ہے امتحان کو ایک مہینہ رہ گیا ہے اور یہ سیر سپاٹوں میں پھر رہے ہیں۔ آنے دو اس کے اَبّا کو۔" وہ اُٹھ کر بڑبڑاتی ہوئی کمرہ میں چلی گئیں۔ مگر اب اُنھیں سکون کہاں تھا۔ پھر باہر آئیں۔

"کہاں گئے یہ نواب صاحب؟" رشید بھی باہر سے آ گیا اور پھر تو بوا برس

برس ہی پڑیں ——— سارا گھر سر پہ اُٹھا لیا لیکن رشید کو بھی کچھ ایسی ضد چڑھی کہ چاہے بوا کچھ بھی کر ڈالیں مگر وہ جائے گا ضرور اس نے غصہ بھی دکھایا اور پھر خوشامد بھی کی۔

"تو بوا جی آپ کو کپڑا بھی تو منگانا ہے آخر اس کے لئے بھی تو آپ کسی کو بھیجئے گا نا"

رشید کو یہ ایک نئی چال سوجھی اس طرح کرایہ کا روپیہ بھی بُوا سے وصول ہو جائے گا۔ اب بوا بھی کچھ ٹھنڈی ہو چکی تھیں۔ یہ بات بھی ٹھیک تھی انکو کپڑا اور گوٹا فریدہ کے بیاہ کے لئے منگانا تھا وہ چپ ہو رہیں۔ اچھا ہے کپڑا ہی آجائے گا۔ رشید بھی باہر کو نکل گیا۔

"فریدہ جلدی جلدی سب چیزیں میز پہ لگانے لگی۔ معلوم نہیں کتنے مہمان آئیں گے اُس نے چھ پیالیاں لگا دیں۔ ہوں گے کتنے ہی ہوں ——— چیزیں تو اس نے بہت تیار کر لی ہیں۔ دو پہر سے لگے لگے یہ وقت آگیا آج تو کپڑے میں ٹانکہ بھی نہ لگا۔ اب رات کو اُسے سر مارنا پڑیگا۔

"ارے بھائی رشید!"

ایک گورے چٹے ہاتھ نے پردہ ہٹایا۔ فریدہ ادھر سے پیٹھ کئے برتن لگا رہی تھی وہ چونک پڑی۔

"کون ہے ؟" ——— اجنبی آواز ——— دروازہ کھلا رہ گیا تھا

اُس نے پیچھے مُڑ کے دیکھا۔ کوئی پردہ کے پاس کھڑا تھا۔ نیلا سوٹ ——
وہ گھبرا گئی —— بھاگتی تو کدھر وہ وہیں کرسی کی آڑ میں ہو گئی پر وہ بھی
فوراً ہی ہٹ گیا اُسے کیا خبر تھی کہ یہاں کون ہے —— نیلا سوٹ
پہنے تھا۔ خوب موٹا تازہ —— رنگ بہت سفید تھا۔ جب ہی تو نیلا سوٹ
اتنا خوبصورت معلوم ہو رہا تھا —— یہ وہی معلوم ہوتے ہیں کیا نام
—— نام اس کے ذہن سے اُتر گیا —— ہاں وہی بھیّا کے
دوست —— ہاں ٹھیک ہے یہ احمد تھے بڑے آدمی کے لڑکے ہیں کیسا بڑھیا
سوٹ پہن رہے ہیں اور کلائی پر گھڑی بھی تو باندھے تھے۔

"سب چیزیں لگا دیں بھنو" —— رشید نے پوچھا۔ فریدہ ایک دم سے گھبرا گئی کہیں وہی نیلے سوٹ والا تو نہیں آگیا۔ اس نے یہ بھی نہ سوچا کہ وہ اس سے باتیں کیسے کرتا رشید بھی کام میں فریدہ کا ہاتھ بٹانے لگا۔

"آج تو نے بڑا کام کیا —— میری عزت رہ گئی۔ جب ہماری بھنو چلی جائے گی تو پھر ہم اکیلے رہ جائیں گے کوئی بات بھی پوچھنے والا نہ رہیگا" مگر فریدہ چپ رہی وہ نہ جانے کیا سوچ رہی تھی گال جیسے انگاروں کی طرح دھک رہے ہوں۔ کنپٹیوں سے آگ سی نکل رہی تھی۔ وہ جلدی جلدی سب ٹھیک کر کے دوسرے کمرہ میں چلی گئی۔

"نیلا سوٹ والا ـــــ ہاں احمد ہی ہوگا ـــــ بھیّا کا دوست کئی دن ہوئے بھیّا کہہ بھی رہے تھے کہ احمد نیلا سوٹ پہن رہا ہے بڑے قیمتی کپڑے کا ہے" ہر پھر کے اس کے سامنے احمد ہی آ کھڑا ہوتا۔ وہ پھر اپنا دوپٹہ رے کے بیٹھ گئی اس کی سوئی گوٹے کے تاروں میں سے سر سر نکل رہی تھی اور وہ سوچ رہی تھی۔ وہ بھی آج کہیں جا رہے ہیں ـــــ جبھی تو ایسا بڑھیا سوٹ پہنکر آئے ہیں ـــــ بھیّا بھی اُنھیں کے ساتھ جا رہے ہوں گے بھیّا کہہ رہے تھے کہ احمد کی بھی شادی نہیں ہوئی ہے۔ وہ ابھی پڑھتا ہے۔ اس نے اپنے سر کو زور سے جنبش دی۔ وہ بھی کیسی کیسی باتیں سوچ رہی ہے۔ اس کو کیا مطلب اس کی شادی سے، ہو یا نہ ہو اُس کی تو منگنی ہو ہی گئی ہے اب اگلے مہینہ میں اس کی شادی بھی ہو جائے گی اُسے کیا حق ہے کہ وہ غیر مردوں کے متعلق سوچے مگر اُس میں اس کا کیا قصور وہ کوئی جان کے تو اس کے سامنے چلی نہیں گئی تھی۔ وہ تو میز پر برتن لگا رہی تھی اُسے کیا خبر تھی کہ وہ آ جائے گا کیسا بدتمیز آدمی ہے بغیر آواز دئے ہی پردہ کھول دیا۔ اس نے اپنے دوپٹہ کو ٹھیک کرکے اوڑھا جیسے وہ اس کے سامنے تو کھڑا ہے۔ باہر ہی سے آواز دیدیتے اُسے اپنے اوپر ہنسی آئی پھر کیا ہوا .... مگر اس کا کچھ بگڑ تھوڑا ہی گیا ـــــ اُدھر ـــــ وہ جلدی جلدی گوٹا ٹانکنے لگی۔ احمد کی جب شادی ہو جائے گی تو اُس کی بیوی بڑی خوش رہا کرے گی کتنا اچھا اس کا شوہر ہے۔ خوبصورت بیوی تو سب

ڈھونڈھتے ہیں مگر یہ کوئی نہیں دیکھتا کہ خوبصورت شوہر بھی تو ہو جیسے لڑکیوں کے دل ہی نہیں ہوتا ان کے لئے تو بس شوہر تلاش کیا جاتا ہے۔ چاہے کیسا ہی بدصورت ہو۔ جبھی تو زیادہ تر شادیاں کامیاب نہیں ہوتیں ــــــــ

اس نے سیتے سیتے ادھر نظر اٹھائی سامنے بڑا آئینہ لگا تھا گندمی رنگ بڑی بڑی سیاہ آنکھیں۔ یہ اسی کا چہرہ دکھائی دے رہا تھا وہ بھی تو خوبصورت ہے۔ اُسے ایسا معلوم ہوا جیسے احمد نیلا سوٹ پہنے اس کے قریب کھڑا ہے وہ جھینپ سی گئی مگر اُس جھینپ میں بھی تو ایک لذّت تھی۔

"فریدہ بھنو!"

اس نے مڑکر دیکھا۔ دروازہ میں رشید کھڑا تھا۔

"میں جارہا ہوں ــــــــ سب برتن اُٹھا لینا"

"اچھا" ــــــــ وہ یہ کہہ کر چپ ہو رہی ــــــــ اور پھر سینے لگی۔

× × × × × × × × × ×

رشید اور احمد موٹر میں بیٹھے ہوئے اسٹیشن جارہے تھے۔ زندگی میں ایسے موقع بھی کم آتے ہیں۔ اس نے اپنے سوٹ کی طرف ایک نظر کی گویا وہ اپنا جائزہ لے رہا تھا کہ آیا وہ اس موٹر میں بیٹھنے کا حق بھی رکھتا ہے یا نہیں کون مجھے یہ دیکھ کر کہدیگا کہ یہ شخص بہت کم موٹر میں بیٹھا ہے یہ موٹر احمد کی نہیں ہے

اُس نے احمد کی طرف دیکھا اور پھر آپ ہی آپ کچھ شرمندہ سا ہوگیا یہ موٹر اس کی نہیں تو کیا ہوا۔ دنیا میں کتنے ہیں جن کے پاس موٹریں ہیں فی الواقعی موٹر والے توانگی پر گنے جاسکتے ہیں۔ موٹر والے کتنے خوش قسمت ہوتے ہیں۔ اس نے دوبارہ احمد کی طرف دیکھا موٹر تیزی سے چلی جارہی تھی ۳۰ میل فی گھنٹے کی رفتار کافی تیز تو ہوتی ہے۔ موٹر آگے جارہی تھی دوکانوں کی عمارتیں پیچھے چھٹتی جارہی تھیں پیدل چلنے والے راہگیر پیچھے رہے جارہے تھے۔ زندگی ایک دوڑ ہے رشید نے دل ہی دل میں کہا۔ جس میں موٹر والے منزل پر پہلے پہنچتے ہیں اور پیدل چلنے والے پیچھے رہ جاتے ہیں۔ وہ ہنسا وہ بھی بعض اوقات کیسے کیسے فلسفیانہ خیالات کو اپنے ذہن میں جگہ دیتا ہے وہ ایسی باتیں کیوں سوچتا ہے جیسے وہ کبھی موٹر میں بیٹھا ہی نہیں۔ لیکن وہ کیا کسی سے کم ہے؟ اگر اس کے پاس موٹر نہیں ہے تو کوئی خاص کمی نہیں۔ اپنے دوستوں میں وہ کسی سے ہٹیا نہیں۔ سینما وہ دکھاتا ہے دعوتیں وہ کرتا ہے اور آخر ایسی کون سی بات ہے جو اس میں نہیں ہے۔ ——— ہاں موٹر ضرور اس کے پاس نہیں ہے مگر اُس میں کون سی کمی ہوجاتی ہے۔

اُس نے کھڑکی میں سے سر نکالا۔ کچھ پتہ نہیں چلتا کہ وہ اس وقت کہاں ہے۔ اتنے دن یہاں رہتے ہوگئے اور اس کو یہ نہیں معلوم۔ لیکن اس میں اس کا کیا قصور ہے موٹر کی بات ہے۔ موٹر بھی کتنی عجیب چیز ہے۔ ذرا سی دیر

ہیں کہاں سے کہاں پہنچاتی ہے۔

"رشید! بھئی سیکری بھی جائیں گے۔"

"اچھا"——

رشید پھر خاموش ہوگیا۔ اس وقت معلوم نہیں کیوں وہ ایک عجیب پریشانی میں مبتلا تھا۔ ایسی کون سی بات تھی جو اس کا پیچھا نہیں چھوڑتی۔ آخر کوئی بات بھی تو ہو۔ ہاں تو سیکری بھی جانا ہے۔ اس نے دل ہی دل میں سوچا اور اس کے پاس مشکل سے سات روپے بچتے ہیں۔ باقی روپیہ تو بوا کا ہے جس کا کپڑا خریدنا ہے اگر اس میں سے ایک پیسہ بھی خرچ ہوگیا تو مصیبت ہو جائے گی۔ ہاں تو پندرہ روپیہ تو ٹکٹ ہی میں خرچ ہوتے ہونگے۔ انٹر کا ٹکٹ۔ کاش وہ تیسرے درجہ کا ٹکٹ خرید سکتا مگر یہ بھی تو مجبوری ہے۔ تیسرے درجہ کا ٹکٹ —— ناممکن آخر احمد انٹر سے کم میں تو بیٹھنے سے رہا اتنے بڑے آدمی کا لڑکا ہے —— تیسرا درجہ —— ناممکن —— اُس نے گردن کو زور سے جھٹکا دیا مگر انٹر میں بیٹھنے میں بھی تو مشکل ہے۔ بلکہ مجبوری وہ کیسے احمد کے ساتھ بیٹھ سکتا ہے۔

کاش وہ احمد کا دوست نہ ہوتا۔ پہلے اس کی دوستی صرف ہنگی چڑتی تھی مگر آج اُس کے لئے اس کا نباہنا مشکل ہو رہا تھا۔ پیسے والے کی دوستی مگر اس میں اُسی کی تو غلطی ہے۔ کتنے لڑکے تھے مگر اُس میں سے اُس نے اتنا بڑا انتخاب کیا۔ اٹھرہی میں کون سی بُرائی تھی کتنا ہنس مکھ تھا مگر اُس نے اس کی غربت کی بنا پر اسکو ٹھکرا دیا۔

حالانکہ وہ اس سے بیحد محبت کرتا ہے۔ خیر چھوڑو ان باتوں کو۔ اونہک ——— اس نے پھر گردن کو جھٹکا دیا۔

"میاں اُترو بھی ——— جیسے کبھی موٹر میں بیٹھے ہی نہیں پھر کسی روز ٹہلا لائیں گے۔ چلو وقت کم ہے۔"

احمد نے ہنسکر کہا۔

رشید چونک پڑا۔ پانی پانی ہوگیا۔ کاش وہ اس وقت کچھ نہ سوچتا۔ کاش اس کے پاس بھی موٹر ہوتی۔ احساس کمتری اپنی بلندی پر تھا۔ اس کو اپنی غربت پر غصہ آرہا تھا۔ کاش وہ بھی دولت مند ہوتا۔

رشید موٹر سے اُتر چکا تھا مگر اس کا دماغ اس کا پیچھا چھوڑنے کے لئے تیار نہیں تھا اس طرح اگر وہ آگرہ گیا تو کیا خاک اس کو مزہ آئے گا۔ احمد کے ساتھ اس وقت وہ ایک منٹ کے لئے بھی خوش نہ رہ سکتا تھا مگر یہ تبدیلی یکایک کچھ ٹھیک نہیں ——— وہ اسٹیشن کی طرف بڑھ رہے تھے۔ موٹر جا چکی تھی۔

"گاڑی چھوٹنے میں صرف پندرہ منٹ رہ گئے ہیں۔"

احمد نے کہا۔

رشید نہ جانے کیا سوچ کر رک گیا۔

"تم چلو میں ابھی آتا ہوں۔ ذرا ٹھیک وقت معلوم کروں۔" احمد آگے بڑھ گیا۔

رشید وہیں رک گیا خیالات کا ایک ہجوم اس کے دماغ کو پریشان کر رہا تھا۔ کہیں

وہ پاگل نہ ہوجائے ــــــــــ ٹکٹ کلکٹر کو دیکھ کر رشید اس کے پاس چلاگیا۔ مگر اس کی نظریں برابر احمد کا تعاقب کر رہی تھیں۔

"گاڑی میں کتنی دیر ہے"۔ اُس نے یہ سوال یونہی کیا۔ لیکن احمد کی طرف برابر دیکھتا رہا۔

"آپ کا مطلب کس گاڑی سے ہے۔ پھر یہ سوال تو کچھ مہمل سا ہے معلوم نہیں آپ کس گاڑی کو پوچھ رہے ہیں آنے والی یا جانے والی"ــــــــ

رشید نے کوئی توجہ نہیں دی۔ جیسے اس سوال کے پوچھنے سے اُس کا مطلب جواب پانا سرے سے تھا ہی نہیں ــــــــ

"آپ بھی عجیب آدمی ہیں"۔ ٹکٹ کلکٹر کہتا ہوا آگے بڑھ گیا۔ رشید کی نظریں احمد پر گڑی ہوئی تھیں جو دوسرے درجہ کے ٹکٹ گھر کے سامنے پہنچ کر رک گیا تھا رشید کانپ اُٹھا۔

"میں احمد کے ساتھ نہیں جاؤنگا ــــــــ ہرگز نہیں" ــــــــ اسکی زبان سے یک بارگی نکلا۔ اُس کا دماغی ہیجان بڑھتا جا رہا تھا۔ وہ نیم پاگل معلوم ہو رہا تھا۔ وہ سر جُھکائے واپس چل دیا۔

وہ گھر جائے گا۔ دوسرے درجے کے پیسے اس کے پاس کہاں احمد تو بڑے آدمی ہیں اور وہ تو انٹر کا ٹکٹ ہی بمشکل خرید سکتا تھا ــــــــ ان بڑے آدمیوں کا شوق ــــــــ ان کی دوستی سے وہ باز آیا۔ اسکو آج پہلی بار محسوس ہوا کہ

تھا کہ گویا اس کا دماغ کسی قید سے آزاد ہوگیا تھا۔ وہ موٹر میں آیا تھا لیکن کتنا تھک گیا تھا۔ اونچے طبقے سے ہاتھ ملانا ناممکن ہے۔ اُسے متوسط طبقہ سے انتہائی ہمدردی پیدا ہوگئی تھی۔ ان لوگوں کی دوستی ——— آج طبقاتی کش مکش کے ایک پہلو کو رشید نے اچھی طرح سمجھ لیا تھا جس کو بڑے بڑے سیاستداں اُسے نہ سمجھا سکتے تھے۔ کاش دنیا میں ایک انقلاب ہوتا جو ایک غیر طبقاتی نظام قائم کرسکتا ——— جس میں ہر شخص انٹر کلاس میں بیٹھ سکتا ——— تیسرا درجہ ——— ڈیوڑھا درجہ اور دوسرا درجہ گویا یہ تین طبقہ ہیں ان تینوں ڈبوں میں جتنی نزدیکی ہے اتنی ہی دوری کیوں ———

اس نے احمد کا ہر جگہ ساتھ دیا۔ ہر دعوت میں اس کے دوش بدوش تھا سینما میں اس نے وہی ٹکٹ لیا۔ مگر ریل میں وہ اس کا ساتھ نہ دے سکا۔ مگر اس وقت اس کا ساتھ دینے کے لئے اس کے دل میں کوئی آرزو نہ تھی۔ آج اتنے عرصہ کے بعد اس کے دماغ کو سکون میسّر ہوا۔

وہ سر جھکائے چلا جا رہا تھا۔ فریدہ کی شادی میں اطہر کو ضرور بلائیگا۔

چاول کے دانے

"آج چھ دن ہو گئے۔ کھانے کو کچھ ملا نہیں ہائے اللہ کیا کرے۔ اتنے دن گھربار بیچ باچ کر سب کھا گئے۔ پر اب تو کچھ بھی نہیں ہے جو کھائیں۔ ایک کھاٹ، دو برتن! شفّو اور منّو یہ دو ہیں! نذیر بھی جب سے گیا واپس نہیں آیا! یہ بچے بلکتے ہیں۔ میں کیا کروں! تھوڑا سا بھی کھانے کو ہوتا تو میں خود نہ کھاتا انھیں کو کھلا دیتا لیکن چھ دن سے ایک پھیل بھی اڑ کر منہ میں نہیں گئی۔ میں نے برداشت کر ہی لیا۔ مگر یہ کیسے کر رہے ہیں۔ کتنے ضدی بچے تھے۔ چار روز سے کچھ کھایا نہیں۔ پر روتے تک نہیں، ماں ان کے سامنے مری۔ دادی کو انھوں نے مرتے دیکھا، مگر روئے

نہیں، جب سے چپ ہیں! ایک آدھ گھنٹے رونے سے کیا ہوتا ہے۔ ماں ایسی چیز تو نہیں ہوتی پر بھوک نے یہ سب کر دیا۔ نذیر سمجھ میں نہیں آتا کہ انھیں چھوڑ کے کیوں چلا گیا؟" اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ اس کا بچہ کلکتہ گیا پر وہاں سے واپس نہیں آیا۔ کیا اُسے بھول گیا۔ پر اپنے بچوں کا تو خیال کیا ہوتا۔ مگر یہ بھی ہو سکتا ہے کہ وہ خود مصیبت میں پھنسا ہو سارا اسنسار مصیبت میں ہے۔

اس کا نذیر ایسا تو نہ تھا کہ اپنے باپ کو بھول جاتا وہ جانتا تھا کہ اس کا بوڑھا باپ کچھ نہیں کر سکتا۔ آخر ان بچوں کو کون کھلائے گا۔ اس کے پاس جو کچھ تھا وہ اس نے خرچ کر دیا۔ اگر ہوتا تو وہ اپنی بہو کو کیوں مرنے دیتا۔ پر اس میں اس کی غلطی بھی تو تھی۔ برے بھلے جیسا بھی ہوتا گذر کرتی مگر وہ تو اپنا کھانا بچوں کو کھلا دیتی ــــ پر وہ بھی کیا کرتی۔ ماتا ایسی ہی ہوتی ہے۔ اس نے اپنی جان کی ذرا بھی پرواہ نہیں کی۔ بڑے صبر کی لڑکی تھی۔ بھوک سے مری پر اس نے مرتے مرتے یہ نہ بتایا کہ بھوکی ہوں۔ پر یہ کوئی چھپنے کی بات تو نہ تھی۔ ہر کوئی جانتا ہے کہ بھوک سے مرنے والے کی صورت کیسی ہوتی ہے۔ کس نے ان دنوں مرتوں کو نہیں دیکھا۔ سارا گاؤں سونا ہو گیا۔ ہم نے اپنی آنکھوں سے بیسیوں کو مرتے دیکھا۔ نضلی بھیّا۔ ابھی کل ہی مرے ان کے دونوں بچے۔ آج صبح ہی مر گئے خوب چلا رہے تھے۔ چاول! ــــ چاول!! ــــ اس کی آنکھوں کے گرد سیاہی چھا گئی۔ سر چکرانے لگا۔ زمین گھومتی ہوئی دکھائی دینے لگی

تھال میں چاول۔ پر وہ سویا تو نہیں تھال میں چاول کیسے آیا۔

میرا نذیر آگیا۔ چاول لایا ہے۔ آدھ سیر سے کم تو نہ ہوں گے۔ لونڈا بڑا سمجھدار نکلا میں تو جانتا تھا کہ لائے گا ضرور چاہے دیر لگے۔ "نذیر"! اس کی زبان سے آہستہ سے نکلا۔ آنکھوں کے سامنے سیاہی چھا گئی چاول کہاں۔ وہ سو گیا ہو گا۔ خواب دیکھا ہو گا۔ پر بھوک سے نیند بھی تو اڑ گئی۔ خالی پیٹ میں پانی بھی تو لگتا ہے۔ سارے پیٹ میں جلن ہو جاتی ہے۔ جیسے سوئیاں چبھ رہی ہوں۔ رگیں بھی کھنچنے لگتی ہیں۔ پر چھ دن سے پانی چھوڑ کھایا ہی کیا ہے۔ گھاس بھی تو سوکھ گئی۔ ایسے میں ہو گا کیا۔ کتنے دن ایسے گذریں گے ہم نے بھی تو پہلے ٹھاٹ ہی کئے تھے۔ یہی جگہ تھی۔ اب سے بہت دن پہلے جب کوٹھری میں چاول ہی چاول بھرا تھا بہو آکر کہتی۔

"ابّا چلو کھانا تیار ہے"۔

"پر بیٹی بچوں کو تو کھلا دے"

"سب کو کھلا دیا"

"نذیر آیا؟"

"نہیں"

"کہاں گیا ہے؟"

" وہ ابھی کہاں۔ کتنی رات گئے آئیں گے۔ شام کو جب جاتے ہیں

جانتے ہیں ایسے ہی آتے ہیں۔"

"معلوم نہیں بدماش کہاں گھومتا ہے۔ آج آنے دو۔"

"نہیں ابا آج اپنے دوست کے یہاں کھائیں گے۔"

"کیوں؟"

"کہہ گئے تھے دعوت ہے۔"

"بڑا شوقین ہے، گھر تو کھایا نہیں جاتا ہے دوسروں کے یہاں کھاتا پھرتا ہے۔"

"ابا ——— با ———" اس باریک اور کمزور آواز نے اس کے خیالات کے سلسلے کو توڑ دیا۔ وہ چونک پڑا۔ "شفو" ——— اس نے کہا۔ ہاں شفو ہوگی، پر اس کی آواز ایسی تو نہ تھی، مگر ہے وہی بھوک کی مار کیسی ہوگئی ہے؟ اگلے مہینہ میں اس کا بیاہ ہونے والا تھا، میری بٹیا! ——— میری بٹیا!" ——— اس کی زبان سے نکلا جس نے خیالات کی گہرائیوں سے ابھر کر فضا میں ایک ہلکا سا ارتعاش پیدا کر دیا۔ پر وہ اب جائے تو کیسے اٹھنے کی طاقت نہیں۔ اسے کچھ نہ کچھ تو کرنا ہی پڑے گا۔ یہ بچے بھوکے مرجائیں گے ——— ان کا مرنا ——— "ہائے اللہ" ——— دوبارہ اس کی زبان سے آہستہ سے نکلا، میرے پاس رکھا ہی کیا ہے۔ میرا دھن ——— بس یہ بچے ہیں پر یہ کیسا دھن۔ یہ تو خود بھوکے ہیں، دھن اور بھوکا۔ اسے ہنسی آئی وہ ہنسا

بھی تو بھول گیا تھا ۔ یہ ہنسی بھی کیسی جس نے لب تک آ کے آگے جانے سے انکار کر دیا ـــــ مگر وہ کیا کرے اس دھن کو کیسے کھلائے کوئی یہ کھاٹ ہی لے لیتا اور ان بچوں کے لئے کھانے کو کچھ دیدیتا لیکن دے گا کون ۔ ہر ایک کو چاول چاہئے ۔ ایسے میں کون خرید لیتا ہے ۔ پہلے سے بک جاتی تو کوئی بات بھی تھی مجھ سے تو ہلا جاتا نہیں ۔ کس کے پاس جاؤں ـــــ اتنے دن سے کھانے کو نہیں ۔ اس نے پیٹ کی طرف دیکھا ۔ ہائے اندر سے کتنا دکھ رہا ہے ۔

اس کی پسلی کی ہڈیاں ـــــ کیسی سب کی سب دکھائی دے رہی ہیں اس کے بدن میں گوشت بھی ختم ہو گیا تھا ۔ ان بچوں کا نہ جانے کیا حال ہو گا ۔ جب اُسکا یہ حال ہے جس نے سوا سیر کا گھی کھایا تھا ۔ اس کی تو ہڈی ہڈی باہر دکھائی دے رہی ہے ـــــ یہ تو کھال رہ کے ہوئے ہے نہیں تو کب کی باہر آ جائیں ـــــ پر یہ نیچے برا حال ہو گا ان کا ـــــ یہ بول کیوں نہیں رہے ـــــ غضنفر اور منو دونوں چپ ہیں ـــــ لیکن ابھی غضنفر بولی تو تھی ـــــ یہ چپ کیوں ہو گئی ـــــ کہیں ایسا تو نہیں کہ ـ ـ ـ ـ ـ اس کی آنکھوں میں سے ایک آنسو آہستہ آہستہ باہر نکل آیا لیکن پھر وہیں جم کر رہ گیا ـــــ اب یہ آنسو بڑھتے جا رہے تھے ـــــ بڑھتے بڑھتے ایک مرتبہ وہ بھی اندر سے نکل پڑے لیکن گالوں پر آنے کے بجائے

ایک ایک کر کے زمین پر گرنے لگے ـــــــــــ کلتوں پر تو کیا تھا وہاں آپ گڈھا تھا۔ اوپر والی ہڈی پر تھوڑی دیر رک گیا گویا وہ جائزہ لے رہا تھا اور پھر وہ قطرے دیر تک اسی انداز سے ٹپکتے رہے ـــــــــــ اس نے اٹھنے کی کوشش کی ـــــــــــ پر یہ سامنے سے کون آرہا ہے ـــــــــــ کوئی چاول والا ہوگا، چاول والا ـــــــــــ اب اس کے جسم میں کچھ طاقت بھی آگئی تھی ـــــــــــ کہیں یہ نذیر تو نہیں؟ ـــــــــــ نہیں یہ تو کئی آدمی ہیں وہ اکیلا تھا بولتے آرہے ہیں، اور وہ اپنے بچّوں کے پاس تک نہیں جا سکتا۔ چاول تو لایا ہوگا۔ مگر ہات میں تھالی بھی تو نہیں ۔ لیکن کوئی پکے چاول تھوڑا ہی لایا ہوگا ۔ لیکن بورا ابھی تو نہیں ہے ۔ اس کی امیدیں ٹوٹ چکی تھیں۔ یہ لوگ اس کے کس کام کے ۔ ایسے تو دن رات آتے رہتے ہیں۔ اس نے سر جھکایا رات ہوتی جارہی ہے نیند آجائے تو کتنا اچھا ہو صبح ہوتے پھر دیکھا جائے گا کہیں ایسا نہ ہو کہ رات کو مر جائے ـــــــــــ موت بس ـــــــــــ موت! نہیں وہ مرے گا نہیں ابھی بہت وقت باقی ہے وہ کوشش کرے گا ضرور کہیں نہ کہیں انتظام ہو جائے گا۔ کسی طرح ان بچوں کے دم میں دم آئے میرے لال ـــــــــــ

"بڑے میاں!"

ایک آواز نے اسے چونکا دیا۔ ایسی آواز جو خواب میں سنائی دیتی ہو لیکن

خواب کیسا، کتنے دن سے تو وہ سویا بھی نہیں کہیں کوئی بھوکا بھی سوتا ہے۔ نہیں غلط بات۔ یہ کوئی ہے ہوگا تو اپنے آپ ہی بولے گا۔ اس کا سر جھک کارہ گیا تھا ———

"بڑے میاں کیسے بیٹھے ہو؟" ——— نہیں کوئی نہ کوئی تو ضرور ہے ——— نذیر کی آواز تو وہ پہچانتا ہے۔ اس نے بمشکل تمام سر اٹھایا تین سپید پوشش اس کے سامنے کھڑے تھے۔ بڑے موٹے تازے سفید چاول کی طرح، چاول دیگچی میں پھول جاتا ہے "جی سرکار" اس کی زبان سے نکلا "بھوکا ہوں سرکار" ——— "چاول" ——— "میرا نذیر" ——— "ننھو اور منو" ——— "ہائے سرکار" ——— "چاول" ——— "سرکار میں مر جاؤں گا میرے بچے بھی مر جائیں گے۔"

"کچھ پیسہ لوگے۔"

"چاول سرکار" ——— بھوک۔"

یہ لوگ پیسے دیں گے پر پیسے سے کہیں کوئی بچتا ہے ——— بچ تو سکتا ہے۔ پر چاول کہاں ملے گا، کون جائے گا۔ میرے پیر اٹھتے نہیں ——— ہائے اللہ وہ کیا کرے۔ چاول ان کے پاس نہیں۔ پیسہ بھوک نہیں مارتا۔ ایک نحیف آواز نے اسے گھبرا دیا۔ "ابا"

"سرکار یہ میری پوتی ہے۔ ہائے اس نے پکارا تھا، مجھے پکڑ کر پہنچا دو۔

کہیں ــــــ کئی دن کی بھوک ہے ۔ میں نے صبح سے اسے دیکھا بھی تو نہیں

منو وہ تو ابھی تک بولا نہیں ۔ سوتا ہوگا ۔ پر نیند ہی کیسے آئے گی ــــ بھوکا ہے" اس نے اٹھنے کی کوشش کی مگر گر پڑا ــــــ اندھیرا ــــــ

"رات ہوگئی سرکار ۔ اب کیا ہوگا ۔ پر میری آنکھوں سے دکھائی کیوں نہیں دیتا ۔ اندھیرا ۔ سر گھوم رہا ہے ۔ ہائے اللہ ــــــ اللہ"

دو ہات اس کو اٹھانے تاریکی میں بڑھ رہے تھے ۔ "لیکن ابھی تو شام ہے اندھیرا کیسا" ان میں سے ایک نے کہا

"لیکن اندھیرا تو سارے بنگال پر چھایا ہے ۔ جہاں موت ہو وہاں اجالا کیسے ہوسکتا ہے"

"موت ــــــ نہیں حضور ــــــ میں ابھی نہیں مرنا چاہتا ۔ میرے بچوں کا کیا ہوگا، نذیر میرا بچہ"

"نہیں، تم مروگے نہیں، ہم تمھیں کھانے کو دیں گے"

"سرکار تم کتنے اچھے ہو" اس کے ہات آگے کو بڑھ گئے ۔

"چاول ــــــ پر ان کو پکائے گا کون ــــــ"

"ــــــ میری بٹیا ــــــ پر وہ تو اٹھ بھی نہیں سکتی"

"نہیں ہم تم کو پھل دیں گے" ان کی آواز میں بھی نقاہت آگئی تھی، حالانکہ انھوں نے ابھی دوپہر ہی کو کھانا کھایا تھا ۔ ان کی آنکھوں میں آنسو آگئے ۔

"شوکت" اس کے دوست نے کہا۔ "شوکت دیکھو آنسو نہ آئیں ہم کو تو انھیں دلاسا دینا چاہیئے۔"

"پھل؟ بڈھے کی زبان سے نکلا۔ "کیسا پھل؟"

"کیلا ——— ہم تمھیں کیلا دیں گے۔"

"تم مذاق کرتے ہو، ہائے اللہ ایسے میں کوئی بھی نہیں پوچھتا۔"

"نہیں، ہم ہنگامی میں نہیں بات کرتے۔ لو یہ لیلو۔"

"زرد رنگ سفید پڑ گیا تھا۔ ایک نہیں چار کیلے۔ وہ اپنے بچوں کی کھاٹ کے پاس پہنچ گیا تھا۔

"شفو ——— منو ——— کیلا" ——— اس کی آواز میں ایک خاص قسم کی خوشی تھی۔ جیسے وہ موت پر ہنس رہا ہو ——— ——— تو اب کیسے آئے گی، دیکھ میرے پاس تجھ سے بچنے کے لئے یہ ہیں کیلے۔ ان سے کتنے آدمی بچ سکتے ہیں۔

اس نے بغیر چھلکا اتارے کھانا چاہا۔ مگر اس کے منہ نے قبول کرنے سے انکار کر دیا۔

ہائے میرے بچے بھوکے ہیں ——— کیسا جلاد ہوں میں ———

اس نے ایک کیلا شفو کے منہ میں ٹھونس دیا۔ اس کی آنکھیں خود بخود کھل گئیں۔

"بھوک" اُن کی زبان سے نکلا ——— کیلا اس کے منھ میں اپنا کام کر رہا تھا۔ بجلی کی سی قوت اس کے جسم میں پیدا ہو گئی تھی۔ اور اس کی نقاہت بھی جیسے دور ہو گئی ہو۔ ہاتھ پیر کمزور ہو گئے تھے، جیسے ان میں گوشت ہی نہیں تھا۔

"ابا" ——— لڑکی زبان سے دوبارہ نکلا ——— جیسے اس کی قوت ایک بار آ کر جا چکی تھی۔

"ابا ——— بھیا مر گیا"

"ہائے اللہ منو ہر ——— ہائے منو مر گیا۔ وہ سر پکڑ کر بیٹھ گیا اس کے کانوں میں شنو کی آواز گونج رہی تھی۔" ابا بھیا مر گیا"

"میری بیٹی ——— ہائے تو اکیلی رہ گئی ——— میرا بچہ، گھر کا چراغ بجھ گیا" ——— اس کے دماغ میں خیالات نے آنے سے انکار کر دیا۔

"بڑے میاں! ——— یہ کیلا کھا لو ———

کیلا اس کے ہاتھ میں تھا جو عنقریب اس کی کمزور گرفت سے چھوٹنا چاہتا تھا، انھوں نے کیلا چھیل کر اس کو دیا۔ اس نے چبانا شروع کر دیا۔

——— "چھلکا" اس کی زبان سے نکلا۔ اس کو نہ پھینکیے۔ یہ بھی کام آئے گا"

"ہمارے پاس بہت کیلے ہیں۔"

"پر یہ چھلکا بھی تو بیکار نہیں ہے۔ کاش یہ پہلے مل جاتا!" بڈھے کی آنکھوں میں ایک عجیب قسم کی کیفیت پیدا ہو گئی تھی ۔ وہ ایک بہادر کی طرح موت سے لڑ رہا تھا اور اب جیت بھی تو گیا تھا ، لیکن اس طرح آخر کتنے دن کام چلے گا۔ کوئی روز روز ایسے آدمی ملتے ہیں ۔ کل پھر بھوکا رہنا پڑے گا۔ وہ محسوس کر رہا تھا کہ جیسے اس نے دوبارہ زندگی پالی ہو ۔

"بیٹی" وہ بولا "اب تو کیسی ہے ۔ میری ٹبیا کتنی کمزور ہو گئی — تیرا بھیا"——

اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے ، وہ خاموش بیٹھا رہا —— کتنی دیر ہو گئی ۔ اس کو کچھ معلوم نہیں —— ہاں جب اس نے سر اٹھا کر دیکھا تو وہاں کوئی بھی نہیں تھا۔ تینوں آدمی جا چکے تھے ، تین چار کیلے البتہ کھاٹ پر رکھے تھے شفو ساکت و بےحس پڑی تھی ۔

"شفو ٹبیا!"

"ہاں ابا —— میں اچھی ہوں ابا ۔ اب تو اٹھ بھی سکتی ہوں ۔ یہ آدمی کتنے اچھے تھے ۔ میں نے تین کیلے کھائے ۔ یہ آج تو کھانے کو مل گیا ۔ کل پھر بھوکے رہیں گے ابا —— اگر اب کھانے کو نہ ملا تو میرا بھی یہی حال ہوگا جو" —— وہ کچھ کہنا چاہتی تھی مگر کہہ نہ سکی ، اس

کی آواز گلوگیر ہو گئی۔

"ہاں بٹیا ——— ہم ابھی کچھ نہ کچھ کریں ہی گے۔ چلیں سیٹھ جی کے یہاں دیکھو کچھ ہو جائے تو اچھا ہے۔

"بٹیا تو ان کے یہاں کام کرے گی؟"

"ہاں، پر وہ کھانے کو بھی دیں تبھی تو"

"ہاں دیں گے کیوں نہیں۔ اسی شرط پر تو میں تجھے دوں گا؟" وہ سوچنے لگا اگر یہی ہو جائے کہ اس کو سیٹھ جی کال تک اپنے یہاں رکھ لیں تو اچھا ہے۔ اس کو بھی اطمینان ہو جائے گا۔ پر لڑکا سنے گا تو کیا کہے گا کہ میری لڑکی کو بغیر پوچھے بیچ دیا۔ لیکن اب تو وہ مجبور تھا۔ اس کے ہاتھ پیر میں اتنی طاقت کہاں جو وہ کام کر سکے۔ پھر ایسی مہنگائی میں کون کھلا سکتا ہے ——— وہ گھبرا گیا ——— میں سیٹھ جی کے پاس ابھی جاؤں گا، کچھ کہے وہ بڑا آیا ہے نذیر۔ اگر اس کو ذرا بھی خیال تھا تو خود ہی کیوں نہیں آگیا۔ خود تو آرام سے بیٹھ گیا ——— اب میں کیا کروں۔ شنفو کا ٹھکانا تو کرنا ہی ہے۔ منو ——— میرا منو ——— ہائے مجھے معلوم بھی نہ ہوا کہ کب مرا ——— اس نے سر جھکا لیا

"بٹیا ——— چل سیٹھ کے یہاں چلیں۔ رات زیادہ ہو جائیگی ابھی تو چاند نکل رہا ہے ——— تو چل سکتی ہے"

"اہا ——— میں چلوں گی چاول ملے گا ——— پر بھیا کا کیا ہوگا ——— ہائے بھیا مر گیا ——— میرا بھیا" ——— ایک

ہلکی سی چیخ اس خاموشش فضا میں ٹکرائی۔

"مت رو بیٹی ——— کیا کریں تھوڑی عمر تھی، کہاں تک برداشت کرتا، آج کھائے ہوئے بھی تو کتنے دن ہو گئے تھے ——— بس چپ رہو۔ آؤ چلیں بیٹھنے سے کیا فائدہ۔"

چاندنی رات تھی ہر طرف اداسی چھائی ہوئی تھی جیسے جاگتے جاگتے کائنات سو گئی۔ نیند میں ہلکے ہلکے خراٹے کی آواز سنائی دے رہی تھی۔ دو جاندار ڈھانچے اپنا سایہ ڈالتے چلے جا رہے تھے، ان کے پیروں کی آواز آرہی تھی جیسے کوئی سوتے سوتے چارپائی پہ کروٹ لے۔ چپلوں کی آواز تھوڑی سی زندگی تو پیدا کر دیتی ہے ——— نیند بھی دھوکا ہے۔ موت کا عکس ہے لیکن ——— آخر کیا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جیسے زندگی اور موت میں لڑائی ہو رہی تھی۔ زندگی ہار گئی تھی، اور موت جیت رہی تھی لیکن جو آواز کروٹ لینے سے پیدا ہوتی ہے آخر یہ کیا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ زندگی کی کشمکش ہے ——— کون جیتا ہے صبح ہونے دو، آپ معلوم ہو جائے گا۔ اندھیرے میں کوئی چیز اُلجھی ہوئی تھی شاید سورج کی کرنیں ہی ہوں۔

دو تاریک سایہ ان کا ساتھ دے رہے تھے ایک بڑھا دوسری عورت مگر نہیں لڑکی۔ بھوکی عورت، بھوکی لڑکی میں کوئی فرق نہیں۔

بڈھے کی آنکھوں میں آنسو خشک ہو گئے تھے۔ اس کی پوتی اس کے ساتھ تھی۔ آخر وہ جگہ کون سی ہے جو آنے کا نام نہیں لیتی، اس کی آنکھوں کے سامنے کبھی مردہ منّو کی شکل آجاتی اور کبھی زندہ سیٹھ کی۔ وہ اس کے یہاں جا تو رہا ہے پر کیے گا کیا۔ وہ بگڑے گا تو نہیں، نہیں آدمی تو اچھا ہے اس نے محسوس کیا کہ اس کے سایہ کی رفتار تیز ہو گئی ہے۔ دوسرا سایہ پیچھے ہو چکا تھا "شفوا تو پیچھے رہ گئی" وہ رک گیا شفو آگے بڑھ گئی اس نے پھر چلنا شروع کر دیا۔ "کیسی مصیبت ہے۔ بھوک نے یہ حال کر رکھا ہے کہ چلنے کو بھی طبیعت نہیں چاہتی۔ رک گئے تو ایسا معلوم ہوا کہ اب چلا ہی نہ جائیگا "بیٹی میں بھی تیرے ساتھ چل رہا ہوں"

وہ آگے چلتا رہا۔ اگلی موڑ سے تھوڑا پرے سیٹھ کا گھر ہے۔ ہے تو نزدیک، پر پہنچنے میں دیر لگے گی۔ دونوں ساتھ ہو گئے۔ ہوا نے سایوں کو حرکت دی اور وہ رک کر کھڑے ہو گئے۔ ہوا نکل گئی۔ دانتوں کے بجنے کی آواز آ رہی تھی۔ وہ سوچنے لگا کہیں کوئی دانت نہ ٹوٹ جائے یہ دانت کمزور کیوں ہو گئے ۔میں نے تو کچھ کھایا بھی نہیں۔ اس نے منہ بند کرنے کی کوشش کی، سردی کتنی پڑ رہی ہے۔ پاس کہیں آگ بھی تو نہیں، اب تو سیٹھ کا گھر بھی ایسا دور نہیں ——— سیٹھ کا گھرا ——— اندر بڑا گرم ہوگا۔

"چل بٹی، آگے چلیں" ——— جاندار ڈھانچوں نے چلنا

شروع کر دیا، ان کا سایہ بھی تو کہہ رہا تھا مجھے سردی لگ رہی ہے، بھوک لگ رہی ہے۔ وہ کیا کریں وہ خود بھوکے ہیں۔ انھیں خود سردی لگ رہی ہے جب کھانے کو نہیں تو کپڑا کہاں سے لائیں، جب کھانے کو ملتا تھا جبھی کتنا مہنگا تھا۔ اب کیا ٹھکانا ہوگا۔ ٹاٹ بھی تو مہنگا ہو گیا تھا معلوم نہیں کب سستا ہوگا ——— کپڑا ملے نہ ملے چاول سستا ہو جائے ——— بھوک ——— بھوک۔ اس کے دماغ میں اک گونج اٹھی۔ سیٹھ کا مکان تھوڑی ہی دور رہ گیا۔ دیکھو کیا ہوتا ہے۔ سیٹھ کیا کہتے ہیں۔ لیکن وہ کیا کہے گا اس کی بیٹی ——— نہیں پوتی۔ شنفو کو بے کام کر دیا کرے گی۔ بڑی سیدھی ہے کام کرے گی۔ پر کھانے کو دینا۔ بڑی اچھی لڑکی ہے۔ ہائے مگر شنفو نوجوان ہے۔ سیٹھ کے گھر کے لوگوں کا اعتبار، وہ رک گیا بیٹی ٹھہر جا۔ وہ رک گئی اور کیلے کا چھلکا چبانے لگی۔

جوان لڑکی۔ سیٹھ کے گھر، پیسے والے ہیں، چاول والے ہیں۔ کھانے کو تو ملے گا، پر میری آبرو، کنبے والے کیا کہیں گے، کنبے والے وہ کہاں گئے ہیں، پر میں اپنے واسطے تھوڑا ہی کر رہا ہوں اس کا انتظام ہو جائے گا، دونوں وقت کھانے کو ملے گا جان بچ جائے گی، یہ آبرو بھی تو کوئی چیز ہے۔ نہیں وہ اپنی شنفو کو مرنے نہیں دے گا ——— چل بیٹی چلیں ——— شنفو کی جان بچ جائے گی، شنفو تو ڈھانچ ہو گئی ——— اس کا

بیاہ ــــــ پر اس سے یہی اچھا ہے کہ سیٹھ جی کا کام کرے گی کچھ سہارا ہو جائیگا اتنے بڑے آدمی۔ اب ایسا بھی کیا، ان کے بھی تو بہو بیٹیاں ہوں گی۔ آبرو ہر ایک کو پیاری ہوتی ہے وہ اپنے دل میں ہنسنا چاہتا تھا۔ وہ کبھی کبھی کیسی باتیں سوچنے لگتا ہے بڑے لوگ ایسے تو نہیں ہوتے ــــــ سیٹھ کا مکان یہی تو ہے معلوم نہیں کہاں ہوں گے۔ کون سنتا ہے بھوکے کی بات ــــــ

"بڑے میاں۔ جاؤ یہاں سے آگے بڑھو۔"

"بھیا! سیٹھ جی ــــــ" وہ آگے بول نہ سکا

"کیا چاہتے ہو سیٹھ جی سے۔"

"سرکار سے ہم ملیں گے۔"

"اونھوں۔ آپ بڑے گورنمنٹ کے افسر ہیں، جو ملیں گے، جیسے کنٹرول افسر"

افسر تو اس کے سمجھ میں آگیا۔ پر اس سے پہلے اس نے کیا کہا تھا اس نے اس کے سمجھنے کی کوشش بھی نہیں کی۔

"بھوکے ہیں، انھیں سے کام ہے"

"لو وہ آگئے۔ آپ ان سے مل لیجئے۔"

وہ آگے بڑھا "سیٹھ جی" ــــــ اس کی زبان سے نکلا وہ سیٹھ جی سے کیسے بات کرے۔

"کیا بات ہے او بڈھے"۔

"سرکار یہ میری لڑکی ہے اس کو لے لو۔ کھانا کھلانا۔ تمہارا کام کر دیا کریگی"۔

"چلو یہاں سے مجھے فرصت نہیں بیکار باتیں مت کرو کس کے پاس ہے جو کھلائیگا"۔

سیٹھ جی چل دیئے۔

"یہیں بیٹھ جا بیٹی ——— گھر جانے سے کیا فائدہ۔ وہاں کیا دھرا ہے جہاں کھانے کو نہیں وہ گھر ہی کیا۔ وہ گھر اس کا گھر نہیں ——— اتنا موٹا تازہ آدمی ذرا بھی خیال نہیں ہم بھوکے ہیں رحم نہیں آتا۔ بڑے ظالم ہیں پر بیٹھے رہو کچھ نہ کچھ تو ہوگا ہی۔ کوئی نہ کوئی آوے گا تو ضرور۔ بڑے بڑے لوگ رہتے ہیں۔ سیٹھ خود کتنا بڑا آدمی ہے۔ بڑا بھاری کاروبار ہے۔ سنا ہے اس کے یہاں چاول ہی چاول ہے منوں چاول۔ پر یہ نکالتا کیوں نہیں۔ بیچتا تو ہوگا۔ پر دام زیادہ ہے کون خریدتا ہے ڈھائی روپیہ سیر۔ اتنا روپیہ کہاں سے لائیں۔ کال سے پہلے کتنی گاڑی چاول سے بھری اس نے آتے دیکھی۔ گھڑگھڑ کی آواز برابر آرہی تھی۔ کوئی گاڑی ہوگی، اناج سے بھری اتنا اناج ہوتا تو آدمی بھوکے ہی کاہے کو مرتے۔ فصل بھی اچھی ہوئی پر سمجھ میں نہیں آتا کیا ہوگیا۔ اب کیا ہوگا۔ گاڑی کی گھڑگھڑاہٹ ہر لحظہ بڑھتی جارہی تھی۔ ضرور اس میں غلہ ہے۔ اس نے سوچا۔ اتنا غلہ کہاں سے لائے وہ تھک گیا تھا۔ ایسی باتیں سوچنے سے کیا فائدہ۔ اس نے سر جھکا لیا۔ اس کے ہات کانپ رہے تھے۔

——— جاڑا ——— جاڑا ——— وہ گھبرا گیا۔ صبح کیسے ہوگی

بارہ بجنے میں کتنی دیر ہے۔ چاند ابھی تو چمک رہا ہے۔ اس نے دیکھا۔ بہت دن سے اسے بھی تو نہ دیکھا تھا۔

"کون ہے؟" اس مہیب آواز نے اسے چونکا دیا

بڈھے نے سر اٹھایا۔ "سرکار ہم بھوکے ہیں"۔

"اچھا تم کو کھانا ملے گا۔ یہ لڑکی تمھاری ہے؟"

"جی"!

"اچھا چلو میرے ساتھ آؤ"۔ وہ دونوں ان کے ساتھ ہو لئے۔ سیٹھ جی کا لڑکا، اس نے سوچا۔ سیٹھ جی سے اچھا ہے بڑا موٹا کوٹ پہنے ہے۔ اسے سردی لگنے لگی۔ پر اب کچھ کھانے کو تو ملے گا۔ یہاں دالان میں باہر سے تو اچھا ہے اس نے اپنے جسم میں گرمی محسوس کی ——— شفو راستہ بھر کچھ نہ بولی آخر کیا بات ہے۔ کہیں ناراض تو نہیں، لیکن وہ کیا کرے مجبوری ہے، اس کا تو ٹھکانا ہو ہی جائے گا، اس کے بھلے کے لئے تو اس نے یہ کیا ہی ہے، وہ سر جھکائے چلا جارہا تھا۔ ایک کمرے میں پہنچ کر رک گیا۔ اس کے سامنے ایک خوبصورت موٹا تازہ نوجوان کھڑا تھا کالا کوٹ پہنے کالا ——— کالا ——— گونجنے لگا۔ ہر چیز کالی ہے — ہونے دو، میری بٹیا کا ٹھکانا تو ہو ہی جائے گا۔

"بڑے میاں تم اس لڑکی کو چھوڑ جاؤ، تم کو پیسے مل جائیں گے۔

"سرکار میں بھوکا ہوں"۔

"اچھا تم کو چاول مل جائیں گے" ——— اس لڑکی کا کیا نام ہے۔

"شنفو" ——— حضور"۔

"بڑی دبلی ہے"۔

"سرکار بھوک کی مار ہے"۔

"اچھا شنفو! تم میرے ساتھ آؤ۔ بڑے میاں تم کو نوکر چاول لاکر دے گا تم جا سکتے ہو"۔

اس کی آنکھیں جھک گئیں، آج اس کی پوتی بھی اس سے چھٹ گئی، یہی تو اک سہارا رہ گئی تھی۔ اب وہ کیا کرے گا بھوک لگ رہی ہے ——— پر چاول تو ملیں گے ——— وہ نہیں جانتا تھا کہ وہ اس وقت خوش ہو یا رنجیدہ ——— اس کی طبیعت میں ایک نامعلوم سی کیفیت پیدا ہو گئی چاول پانے کی خوشی ——— اس کی بھوک مر جائے گی اب وہ چاول کھائیگا ——— کتنے دن ہو گئے۔ اس نے چاول کی صورت تک نہیں دیکھی تھی۔ اس نے خوش ہو کر اپنا سر اٹھایا ——— "منو" اس کی زبان سے نکلا ——— اس نے اپنے سر کو جھکا لیا ——— وہ افسردہ ہو گیا۔ اس کے دماغ نے آگے سوچنے سے انکار کر دیا۔

"بڑے میاں ——— یہ لو چاول"۔

"لاؤ بھیا" اس نے سر اٹھا کر کہا ——— ڈیڑھ پاؤ تو ہوں گے

ضرور ــــــــ

"بس چلو یہاں سے"

اس نے پھٹے کرتے کی طرف دیکھا۔ دامن کا ہی تو ایک حصہ صحیح سالم تھا۔ اس نے دامن میں چاولوں کو لپیٹ لیا، اب وہ بھوکا نہیں مرے گا وہ آہستہ آہستہ کمرے سے نکل گیا ــــــ ذرا سی دیر میں وہی سڑک سامنے آگئی ــ وہی چاندنی رات ــــ وہی سردی ــــــ کافی رات ہوگئی ــــ شفو ــــــ میری شفو کا تو ٹھکانا ہو ہی گیا ــــــ پر میں نے ڈیڑھ پاؤ چاول پر اس کو بیچ دیا ــــــ ہائے اللہ ــــــ نذیر سنے گا تو کیا کہے گا۔ میں نے اس کی لڑکی کو بیچ دیا ــــــ ڈیڑھ پاؤ چاول پر ــ ڈیڑھ پاؤ چاول معلوم نہیں کہ وہ اس کے ساتھ کیا برتاؤ کرے ــــــ اس کی بٹیا ــــــ اس نے غلطی کی ــــــ آج کا تو ٹھکانا ہو ہی گیا تھا۔ کیلا کافی تھا ــــ کل کہیں نہ کہیں سے انتظام ہو جاتا ــــ اب وہ واپس کیسے جائے۔ اس کے پاؤں جواب دے چکے تھے ــــــ پر وہ جا بھی کہاں رہا ہے ــــ سردی ــــــ ہوا ــــــ اس کے پاؤں کانپ رہے تھے ــــــ ہائے اللہ اب وہ کیا کرے ــــــ اس نے اپنی پوتی کو بیچ دیا ــــ اب وہ اپنے لڑکے کو کیا جواب دے گا ۔ جیسے اس کا لڑکا اس کی آنکھوں کے سامنے کھڑا ہے۔

"ابّا! تم نے شنو کو بیچ دیا —— کیوں بیچا؟ —— خود نہیں کھلا سکتے تھے —— تمھارے پاس کچھ نہیں تھا تو اس کی آبرو بیچ دی۔ تمھیں شرم نہیں آتی، اپنی پوتی کی عزّت بیچ کر تم زندہ رہنا چاہتے ہو۔ مر جانے دیا ہوتا۔ —— تمھاری اتنی عمر ہونے کو آئی۔ عزّت و آبرو کا خیال نہیں —— اور یہ تمھاری گود میں کیا ہے"—— وہ چونک پڑا —— چاول اس کی گود سے چھوٹ کر زمین پر بکھر گئے۔ اس کے پاؤں لڑکھڑانے لگے، دماغ چکر کھانے لگا۔"شنو —— او ——" اس کی زبان سے نکلا، وہ گر پڑا —— "شنّو —— ہی ہی ——" چاند بڑی آب تاب سے چمک رہا تھا لیکن تاریکی سے زیادہ ڈراونی تھی وہ چاندنی —— سایہ نے اس کا ساتھ چھوڑ دیا تھا۔ اب وہاں کوئی بھی نہ تھا۔ چاول کے دانے چاندنی میں چمک رہے تھے۔

MUNICIPAL LIBRARY
Nankana
Sahib.

آندھی

بادل کیسے زور زور سے گرج رہے تھے۔ معلوم ہوتا تھا کہ آسمان پھٹ پڑیگا۔ "ابھی تو دن ہے پر کیسا اندھیرا ہے۔" وہ دیر تک کمرے میں ٹہلتی رہی۔ اس کا دم گھٹا جا رہا تھا۔ اس نے کھڑکی کی چٹخنی اتار دی اور دونوں پٹ کھول دئے۔ ہوا سائیں سائیں کرتی ہوئی کمرے میں بھرنے لگی۔ تارہ نے کھڑکی سے سر نکال کر باہر کو دیکھا۔ بجلی زخمی ناگن کی طرح بل کھا رہی تھی، اور کوئی کوئی بوند بھی پڑ رہی تھی؛ تارہ کی نظریں انھیں لاتعداد بوندوں میں بھٹکنے لگیں۔ آج وہ کچھ اداس اداس سی تھی۔ آنکھیں بوجھل ہو رہی تھیں، بھیگی بھیگی پلکیں مینہ سے بھیگے ہوئے چھپروں کی طرح جھول رہی تھیں

اس نے اپنے جسم کو صوفے پر گرا دیا۔ بیتے ہوئے دنوں کی یاد اس کا دل مسل رہی تھی اور پوری کہانی فلمی تصویروں کی طرح اس کے سامنے گزرنے لگی۔

کھٹ۔ کھٹ۔

کسی نے دروازہ پر دستک دی۔ تارہ نے مڑ کر دیکھا۔ "ہوگا کوئی" وہ زیر لب بڑبڑائی، کسی وقت تو چین نہیں "ہائے رام"۔

وہ جھنجھلا کر باہر کی طرف دیکھنے لگی۔ سامنے بادل کے سیاہ سیاہ غبارے سے اڑ رہے تھے۔ اور پھر پورے آسمان پر پھیلتے جا رہے تھے۔ ایک بار ان کالے غباروں میں بجلی لہرائی جیسے کوئی آسمان پر سونا پھیر رہا ہو، اور پھر اس زور سے تڑخی کہ تارہ کا دل دھک دھک کرنے لگا۔ وہ اس آواز سے کتنا ڈرتی تھی پچھلے سال جب بجلی چمکتی اور بادل شیر کی طرح دہاڑتے تو وہ اپنی ماں سے چمٹ جاتی ——— اور آج اس کی ماں معلوم نہیں زندہ بھی ہے ——— اس کی آنکھیں بھر آئیں، سامنے والی سڑک وہی ہے، جہاں اس نے اپنی ماں اور بھائیوں کے ساتھ کئی دن گزارے تھے ——— پھر اسے اپنا گھر یاد آنے لگا۔ اس کا باپ کھیت مزدور کسان تھا۔ مگر کتنے مزے میں گزر ہوتی تھی۔ وہ دن بھی کتنے سکھ میں گزارے تھے۔ اناج آتا تھا۔ سال بھر چاولوں سے گھر بھرا رہتا تھا۔ نئے نئے چاولوں کی پیچ کیسی اچھی لگتی تھی۔ اور جب منا بھیا سے لڑ پڑتا تو اس کی پیچ کا کٹورا گرا دیتا تھا۔ کیسا شریر تھا منا ——— پھر جب کال پڑا ———

ہائے رام اپنا گھر بھی چھٹ گیا ـــــ گھر میں رہتے تو پھر کھاتے کیا۔ شہر آنا ہی پڑا ـــــ ماں تو بڑا روئی پر دادا کیا کرتے، پیٹ تو بھرنا ہی تھا۔ آدمی پیٹ کے کارن کیا نہیں کرتا،، اس کا گھر اس کی آنکھوں کے سامنے چھا گیا ـــــ سامنے والی نلیا ـــــ پر وہ بھی تو سوکھ گئی ہوگی اور پھر آنگن میں کھڑا ہوا نیم کا درخت بھی اسے دکھائی دینے لگا۔ اور یہ بھی تو جھاکڑ ہو گیا۔ وہ چونک پڑی اس کی آنکھوں کے سامنے اس کا ماضی چکّر کھا رہا تھا۔ گھڑ گھڑ گھڑ ـــــ ادھر ـــــ کوئی جا رہا ہوگا۔ کتاب کے کاغذ اڑتے ہیں اس میں بھی تو ایسی ہی آواز ہوتی ہے کیسی ہی ہوا چلے پر وہ ایسے سلے رہتے ہیں کہ کبھی ادھر ادھر نہیں ہوتے، ان کے لئے تو یہی مصیبت ہے جیسے کال ـــــ سکھ چین کا۔ کیسا تڑ تڑ اتے ہیں۔ پر الگ نہیں ہوتے ایک دوسرے کا منہ چومتے ہیں۔ اس وقت تارہ کے سامنے ایک کتاب کھلی ہوئی تھی جیسے آندھی گزر چکی ہو اور وہ اب اس کتاب کو بڑے مزے میں پڑھ رہی ہو۔ اس کا ماضی اس کی آنکھوں کے سامنے تھا۔ کتنے بھیانک ہیں یہ دن۔ وہ ان کے متعلق سوچنا نہیں چاہتی تھی، کیسی کیسی تصویریں اس کے سامنے پھرنے لگیں۔ ڈھانچے، ٹنگی ہوئی کھال پر یہ تو مردے ہیں۔ چل کیسے رہے ہیں اس نے اپنے سر کو بہت تیزی سے جنبش دی۔ نہیں وہ ان سب کو بھول جائے گی اس کے ماں، باپ، بھیّا، سب ہی کو، نہیں وہ نہیں بھولے گی۔ "دادا؟"

ـــــ وہ دن اسے یاد آ گیا جب اس کا باپ آخری مرتبہ اس سے الگ

ہو رہا تھا وہ کیسا رو رہی تھی۔ اس وقت اس کے باپ کی آواز اس کے کانوں میں گونج رہی تھی۔ "بٹیا! ——— میں آج سنجھا تک بہت سا چاول لاؤنگا خوب کھانا ——— دیکھو اگر نہ جائیں گے تو سب بھوکے رہیں گے، کہاں سے کھانے کو آئے گا!" وہ کیا سب ہی تو رونے لگے تھے۔ منّا کتنا چیخا تھا۔

"دادا میں بھی چلوں گا چاول لینے۔" اس روز تو دادا نے کسی کو ڈانٹا بھی نہیں، خوب ہی چمکارا تھا۔ اس نے محسوس کیا کہ جیسے اس کے باپ کا ہات اس کے کاندھے پر رکھا ہو۔ کاش وہ آکر اس کو تسلی دیتا کتنا اچھا ہے یہ مکان پر وہ اپنے باپ کے ساتھ اس کٹیا میں چلی جاتی۔ اس سے تو اچھا ہی تھا۔ شہر کے نام سے اب اس کو غصّہ آنے لگا تھا۔ کیا اب وہ اپنے گاؤں کو کبھی نہ دیکھے گی۔ بسنتیا معلوم نہیں کہاں ہوگی، اور پھر اس کے سامنے گہرے گہرے سایہ گھومنے لگے۔ وہ بغیا کیسی ہری بھری تھی جو ہمارے گھر سے پیچھے تھی۔ مگر اس کا مالی بڑا غصہ والا تھا۔ جب ہمیں امرود توڑتے دیکھ لیتا تو کیسا ڈنڈا لیکر دوڑتا تھا، مگر بسنتیا بھی بڑی تیز تھی، خوب امرود اور بیر توڑتی اگر کسی دن بڈھا دیکھ لیتا تو زندہ نہ چھوڑتا۔ ہم اسی بغیا ہی سے تو نکل کر آئے تھے، کیا خبر تھی کہ وہ اب اس بغیا کو کبھی بھی نہ دیکھ سکے گی۔ اس کی آنکھیں ساون بھادوں کی طرح برسنے لگیں ہمارے کیسے ہرے بھرے کھیت تھے۔ دادا نے ہی کتنا اناج بویا تھا۔ پر سب ہی مہاجن لیگیا

پھاٹا ہی کیا سارے گاؤں ہی کو لوٹ کر لے گیا ؛ گھر خالی ہو گئے ۔ کھیت اجڑ گئے ، چاول کا دانا دانا مہاجن کے گھر میں چلا گیا ۔ ہائے بھگوان ——— ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے ٹڈیوں کے دل کے دل .. ہرے بھرے کھیتوں پر ٹوٹ پڑے ہوں ۔ کالے کالے بادلوں کی طرح زمین اور آسمان پر چھائی ہوئی ——— اس کے خیالات کے مہرے دماغ کی بساط کو الٹ پلٹ رہے تھے ۔ وہ ایک ہارے ہوئے جواری کی طرح اپنا سب کچھ کھو چکی تھی ۔ مہرے جا چکے بساط الٹ چکی اور بازی بھی ختم ہو گئی تھی ———

وہ اپنے گلے کی مالا سے پھولوں کی پتیاں نوچ رہی تھی ۔ وہ اس جیون سے گھبرا سی گئی تھی ۔ اسے تو وہی پیلے پیلے جنگلی پھول بھلے لگتے تھے ۔ یہ سفید سفید پھول ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ اس کی آنکھوں میں چبھ رہے ہیں ۔ وہ منے کے لئے کیسے زرد زرد پھول توڑ کر لایا کرتی تھی ۔ وہ جب ہم آئے تھے جب بھی منے کے گلے میں ایسا ہار پڑا تھا ۔ منا ، بھیا ، بھورا سب ہی اسے چلتے پھرتے دکھائی دے رہے تھے ۔ پر وہ کسی کو ٹھیک سے دیکھ نہ سکتی تھی ۔ کالے کالے دھوئیں کے غباروں میں سوکھے ہوئے ڈھانچے ——— پھٹی پھٹی سفید آنکھیں ——— یہ تو مردے ہیں ۔ ہائے بھگوان ، کیا سب ہی مر گئے دادا تو بھات لینے کے لئے گئے تھے اور کہہ گئے تھے کہ شام تک آ جاؤں گا پر تین دن گزر گئے ۔ دادا نہ آئے ۔ اور اب تو ایک وقت کا بھی چاول نہ رہا تھا

جو بچوں کو کھلا دیا جاتا۔ پاس پیسہ بھی تو نہ تھا جو سیر آدھ سیر خرید کر ہی منگا لیا جاتا اور پیسہ بھی ہوتا تو کیا کوئی اس سستے پیسہ سے چاول دیتا ہے، اب تو جان کی قیمت پر بھی چاول نہیں ملتا ہائے رام ـــــ اس کی آنکھوں کے سامنے وہ گھر گھومنے لگا جو اس کے باپ نے شہر آکر کرایہ پر لیا تھا، ٹوٹی ہوئی کھاٹ، بجھا ہوا چولھا، اور وہ بجھی بجھی آنکھیں اب تو برتن بھی نہ رہے تھے جو کسی بنئے کو دیکر چاول لے آتی، ایک چھوٹی سی تھالی تھی اور کنارا ٹوٹی ہوئی مٹی کی ہانڈی، ٹوٹی چارپائی کا جھلنگا جو پہلے ہی سے یہاں پڑا تھا۔ معلوم نہیں کس کا تھا اور اپنا بھی ہوتا تو اسے کون خرید لیتا، ماں کیسی دکھی ہو رہی تھی، بھگوان اب غریبوں کو اناج بھی نہ ملا کرے گا۔ ماں یہ کہہ کر کیسی اداس ہو گئی تھی۔ کل ایک وقت کا چاول مل گیا تھا تو ماں نے سب بچوں ہی کو کھلا دیا تھا خود تو ایک دانہ بھی نہ کھایا۔

بادل آسمان پر پھیل کر ایک کالی سی چادر بن گئے تھے اور بارش موسلا دھار ہو رہی تھی، سامنے کچے مکان گر رہے تھے، پرانے پھونس کے چھپر بانسوں پر جھول رہے تھے۔ اس دن بھی تو ایسا ہی موسم تھا، جب منا مرا تھا ـــــ تین دن کا بھوکا ـــــ ہائے میرا بھیا! ـــــ میں نے کہا تھا، میں کہیں نوکری کر لوں۔ پر ماں نہ مانی اس نے کہا میاں جی کو کوئی انگلی اٹھائے گا۔ ہم بھوکے ہیں تو کیا، ہمیں اپنی آبرو کا بھی تو پاس ہے۔

"پھر کیا ہوگا ماں !"

"میرا بڑھاپا ہے بیٹی ! میں کہیں کام کرنے لگوں گی"۔ بھورو کو بھی کہیں لگا دونگی" اس کی ماں نے کہا۔

وہ اپنی سیانی بچی کو کیسے کسی کے گھر اکیلا بھیج دے۔ معلوم نہیں لوگ کیا کیا کہیں اگر وہ ایسا کرے گی تو برادری نہ اسے تھوکے گی، وہ بوڑھی تھی اس کی اور بات تھی مگر وہ گھر میں بھی تو اکیلا نہیں چھوڑ سکتی۔

"تو کب سے بھوکی ہے میری بٹیا" ——— ماں نے کہا "اور یہ بچے کب تک بھوکے زندہ رہ سکیں گے"۔

ماں کا جسم سوکھے ہوئے پتے کی طرح کانپ رہا تھا، زندگی اور موت کی کشمکش، جیون ایک اتھاہ سمندر میں ہچکولے کھا رہا تھا۔ کالے ناگ اسے اپنی طرف دوڑتے ہوئے دکھائی دے رہے تھے۔

"اے بھگوان ! ——— جانے یہ اژدہے ساری دنیا کو نگل لیں گے"۔ اس کے منہ سے نکلا اور اس کا جسم تھرتھر کانپنے لگا۔

سامنے ٹوٹے ہوئے گھروں میں اسے ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ جیسے آگ لگ رہی ہو، اس کی لپٹیں آسمان تک پہنچتی ہوئی دکھائی دے رہی تھیں، مگر اس آگ کو کوئی بجھاتا نہیں، خود ہی بجھ جائے گی، جب ہر چیز راکھ ہو جائے گی تو پھر آگ کس کو جلائے گی، اسے اپنا گاؤں بھی راکھ کا ایک ڈھیر دکھائی دے رہا تھا۔ اور

بنیا بھی جل چکی تھی ۔ جلے ہوئے امرود لٹک رہے تھے ۔ اور بیروں کے پیڑ تو بیر آنے سے پہلے ہی جل گئے تھے ـــــــ اسے ہر چیز جلی ہوئی دکھائی دے رہی تھی، سامنے کے مکان ، چھپر کے گھر اور سامنے کھڑے ہوئے املی اور کھجوروں کے درخت، حتّٰی کہ اس کو اپنے جسم کا ہر حصّہ آگ کی لپٹوں سے جھلسا ہوا معلوم ہو رہا تھا ! ہائے دادا ـــــــ اگر تم نہ جاتے تو کاہے کو ماں اکیلی رہ جاتی ۔ اور میں کیوں اس محل میں آتی ـــ میں ہٹ کرتی ، روتی اور اپنے گاؤں ہی میں جاکر دم لیتی ـــــــ میرے دادا آجاؤ ـــــــ ماں ! تم کہاں ہو؟ ـــــــ پہلے جب میں ہٹ کیا کرتی تھی تو میری ہٹ پوری ہو جاتی تھی ، اور اب کوئی بھی نہیں سنتا ۔ دادا مجھ سے ناراض ہو گئے نہیں تو ضرور خبر لینے آتے ـــــــ اب کس کو پکاروں وہ اٹھی اور کھڑکی سے لگ کر کھڑی ہو گئی ۔ اس کی میز پر کیسے طرح طرح کے پھل رکھے تھے ۔ منّا ہوتا تو کیسے دوڑ دوڑ کر کھاتا جب وہ بیر توڑ کر لاتی تھی اور کہتی ” میں تجھے بیر دوں گی بھیا کہہ دے دیدی اچھی ـــــــ بھورو برا“ ـــــــ

” ہاں دیدی اچھی ـــــــ بھورو برا ـــــــ“ اور وہ دوڑ کر لپٹ جاتا ۔ اس کے منہ سے کیسا اچھا لگتا تھا پر جب کال پڑا اور تین دن اسے کھانے کو نہ ملا تو آنکھیں بھی نہ کھولتا تھا ۔ ننھے ننھے ہاتھ کسی بانس کی کھپچی کی طرح

ہو گئے رہتے، وہ اب ماں، بھیا کسی کو بھی نہ بلاتا تھا، اور ماں کے سینے سے لپٹے چمٹا تھا جیسے اسے گہری نیند آرہی ہے۔

وہ گھبرا گئی ——— کیا اس ہولناک کہانی کو بھول جائے۔ پر کیسے بھولے۔ بھولنے کی چیز بھی تو نہیں، اس کو طوفان کی سی گھڑگھڑاہٹ سنائی دے رہی تھی۔ آندھی آرہی ہے، طوفان آرہا ہے، اور دنیا اس طوفان میں بہی جارہی ہے، ہر طرف دھواں ہی دھواں ہے، دھرتی دھواں ہے، آکاش دھواں ہے۔ قدم آگے نہیں بڑھتے، سامنے کالے دھوئیں کے پربت حائل ہیں۔

"دکھائی نہیں دیتا ماں! ——— رات ہوگئی کیسے چلیں،" بھیا نے ماں کا پلو پکڑ رکھا تھا، سب ہی کی آنکھیں بند ہوتی جارہی تھیں میں نے بھی بہتیری آنکھیں چیریں، رات ابھی کہاں، پر یہ اندھیرا کیوں ہے۔ جو سوجھتا بھی نہیں

"چل بھیا! ——— دیکھو وہ سامنے روشنی دکھائی دیری ہے ننھے ننھے تارے سے جل رہے ہیں"۔

ماں سچ کہہ رہی تھی، سچ مچ ننھے ننھے تارے سے چمک رہے تھے یہ روشنی ہماری طرف آرہی تھی۔ شاید اسی اندھیرے کو دور کرنے کے لئے لیکن یہ چند تارے اس گہری اندھیاری کو کیسے دور کر سکتے ہیں۔ اور یہ ایک دوسرے سے کتنے دور بھی تو ہیں ——— یہ ننھے تارے ایک جگہ

اکٹھا ہو کر جلنے لگیں تو کیسا اچھا ہو، یہ دھواں ہمارے سامنے سے ہٹ جائے۔ ہم راستہ تو دیکھ سکیں"۔

"گھر آ گیا ماں؟" ——— بھورو نے پوچھا

"ہاں آ گیا پر گھر میں کیا رکھا ہے؟"۔

"ماں! ——— بھات" ——— بھیّا سے بولا نہ جا رہا تھا اور ماں بھی چپ ہو رہی۔ کہتی بھی تو کیا۔ صبح سے مارے مارے پھرتے یہ وقت آ گیا نہ کہیں کام ہی ملا اور نہ کہیں پاؤ ڈیڑھ پاؤ چاول ہی ———

"رات کیسے کٹے گی بھگوان!" ——— ماں خود ہی خود بڑبڑائی

"وہ مہاجن کتنا اچھا تھا، پاؤ بھر چاول دے رہا تھا۔ پر ہمیں نے نہ لئے۔ لے لیتے تو بچوں کا سہارا ہو جاتا۔ پر وہ کہتا تھا کہ اپنی لڑکی کو چھوڑتی جا رام ——— رام ——— میں کیسی پاپن ہوں جو ایسی بات سوچ رہی ہوں" ——— ماں کا کمزور جسم کانپنے لگا۔ جیسے اس نے کوئی بڑا بھاری پاپ کیا ہو "میں پاؤ بھر چاول کے لئے اپنی سیانی بچی کو بیچ دوں بھگوان اس دن کے لئے مجھے زندہ نہ رکھے میں غارت ہو جاؤں، ہم بھوکے ہیں تو کیا ہماری آبرو تو ہے" ——— خیالات کلڑی کے جالے کی طرح اس کے دماغ میں الجھ رہے تھے۔

"ماں اب تو مجھ سے نہیں چلا جاتا ——— "یہیں بیٹھ جاؤں"۔

"نہیں بھیّا! ______ گھر تو آگیا بس دو تین قدم اور چلنا ہے"

ماں نے بھیّا کو تسلّی دی۔

"اور منّا ابھی تک سو رہا ہوگا ماں! ______ کیسا اندھیرا ہے

اسے ڈر لگ رہا ہوگا"۔

"منّا! ______ منّا! ______" ماں کے منہ سے کئی دفعہ نکلا۔

وہ تو رات سے سو رہا ہے۔ یہ اندھیاری اس کا کیا بگاڑے گی؟"

تارہ کا دل جیسے ہل رہا ہو۔ اس دن بھی تو آسمان ایسا ہی لدا کھڑا تھا۔

کوئی کوئی بوندبھی پڑ رہی تھی۔ بھیّا کی آواز تارہ کے کانوں میں پھر گونجنے لگی۔

"دادا آگئے ہوں گے ماں؟ ______ بھات بھی تو لائے ہوں گے"

"تارہ کے پیر سے کوئی چیز لگی اور چھن سے آواز سنائی دی۔

"ماں یہ تو ہمارے برتن ہیں"

"اور ہماری ہانڈی بھی تو پھوٹ گئی" بھورو بولا

"ماں کا رنگ کپاس کے پھول کی طرح پیلا ہو چکا تھا۔ اور پھٹی پھٹی آنکھوں

سے کھڑی دیکھ رہی تھی۔

"ماں اب کیا ہوگا ______ گھر کا تو دروازہ بھی بند ہے۔ اور

یہ کیسا گھر گر آیا ہے" مگر ماں نے میری بات کا کوئی جواب نہ دیا۔ بھیّا

کیسا نڈھال ہو رہا تھا۔ اور اب تو پڑنے کا بھی سہارا ختم ہو چکا تھا۔ بھورو پھر بولا۔

"لالہ جی سے کہہ کر تالا کھلوالو انھیں نے بند کیا ہوگا!"

اور سامنے یہ کتے کیا چبا رہے ہیں!"

میں نے پوچھا

"وہ کوئی مردار ہوگا" ——— ماں نے یوں ہی جواب دیا۔ وہ تو گھر کے بند تالے کو دیکھ رہی تھی۔

"ماں! ہمارا منا اب ——— یہ کتے ———" جانے بھیا میں اس وقت اتنی طاقت کہاں سے آگئی تھی جو وہ ایک دم سے چلا پڑا!۔

ہائے بھگوان ——— منے کے ننھے ننھے ہاتھوں کو کتوں نے چبا لیا تھا۔ کتنا بے رحم تھا یہ لالہ۔ منے کی لاش کو بھی اٹھا کر کتوں کے سامنے ڈال دیا تھا۔ اور یہ کتے بھی تو ننھی سی جان پر لپٹ پڑے ——— ہائے منے میں تجھے کتنا پیار کرتی تھی اتیرے گالوں کو کیسے زور زور سے چومتی تھی۔ جب تک تو رو نہ پڑتا اور ماں نہ چلاتی میں چھوڑتی ہی نہ تھی۔

اس کی آنکھوں کے سامنے خون ہی خون تھا، کتے انسانوں کی ہڈیاں چبا رہے تھے۔ چڑ چڑ چڑ ———

اس نے ایک جھرجھری لی اور گھبرا کے پیچھے ہٹ گئی۔ سامنے گھروں پہ چھپر آندھی سے جھول رہے ہیں ان کے ٹوٹے ہوئے بانس بھی تو ایسے ہی چڑ چڑ بول رہے ہیں جیسے انھیں کوئی توڑ رہا ہو۔ دانتوں سے چبا رہا ہو۔ اس دن بھی تو ہر طرف سے ایسی ہی آوازیں آرہی تھیں پر اس اندھیاری میں کچھ دکھائی نہ دیتا تھا۔

"بھگوان کیسا اندھیرا ہے"۔

ماں چلتے چلتے بولی

ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ وہ اندھیرا کالے کالے کانٹوں کی طرح ہمارے پیروں میں چبھ رہا ہے، جالا بن بن کر جسم کو لپٹ رہا ہے۔ جیسے ہم ان تاروں میں بندھے جا رہے ہوں۔

"یہیں پیپل کے پیڑ تلے بیٹھ جاؤ —— اب آگے کہاں جائیں گے؟"

ماں کے پیروں سے اب آگے چلا بھی تو نہ جا رہا تھا۔

"اور گھر کب چلیں گے دیدی"۔

بھیّا نے گھبرا کر پوچھا۔

"چپ رہو بھیّا" —— میں نے اس کا ہات پکڑ کر اپنے پاس بٹھا لیا۔ بارش تیز ہوتی جا رہی تھی۔ کوئی کپڑا بھی تو نہ تھا جسے لپیٹ لیتے۔ بھیا اور بھورو کے سردی سے دانت بج رہے تھے۔ اس روز ہوا بھی کیسی ٹھنڈی تھی۔

تارہ کو پھریری سی آئی جیسے اس وقت بھی وہ اسی پیپل کے پیڑ تلے بیٹھی ہو۔

"بھیا!" اس کے منہ سے نکلا مگر بھیا یہاں کہاں یہ اس کا اپنا کمرہ ہے، ہاں سامنے والی سڑک وہی ہے جہاں پیپل کا پیڑ کھڑا تھا۔

پاس کوئی لنگر خانہ ہی ہوتا تو بھیا کی جان بچ جاتی۔ لنگر خانہ کا نقشہ اس کی آنکھوں کے سامنے گھومنے لگا۔ جہاں دھواں اُٹھ رہا ہو، بہت سے آدمی کھڑے ہوں

گرم گرم چاول کی دیگ جیسے اس کے سامنے ہی رکھی ہوئی ہے ——— چاول ہی چاول ——— پھولا پھولا چاول ——— مٹھی بھر چاول میرے بھیا کی جان بچا دیتے ۔ پر کتنے دن' لنگر خانہ بھی آخر کب تک ساتھ دیتا ——— لنگر خانہ کی عمارت اس کے ذہن میں چکّر کھانے لگی ۔ جو شکل بدلتے بدلتے ایک پیپل کا پیڑ ہوگئی ۔ گھنا سا پیڑ ——— بوڑھا پیڑ ——— چوڑے چوڑے پتے ——— کتنا اچھا تھا وہ پیڑ۔ ہم نے کتنی دیر وہاں آرام کیا تھا ۔ اگر وہ پیڑ نہ ہوتا تو ہم کتنا بھیگ جاتے ۔ پر بھیگ تو پھر بھی گئے تھے ۔ آخر وہ درخت کب تک پانی روکتا ۔ جب موسلا دھار بارش ہو رہی ہو تو ایسے میں کیا ہی گھنا پیڑ کیوں نہ ہو وہ کچھ نہیں کر سکتا ۔ اتنی دیر تو اس نے ساتھ دیا ۔ پر جب پانی رکنے کا نام ہی نہ لیتا تو وہ بھی کیا کرتا ۔ اور ادھر ہوا بھی تو کیسی چل رہی تھی ——— وہ آپ بارش کے تھپیڑوں سے جھول رہے تھے ۔ آخر کب تک انھیں بھیگنے سے بچاتے ——— اس کی ڈالیں ہل رہی تھیں اور بوندیں ٹپک رہی تھیں ۔ جیسے وہ رو رہا ہو ۔ پیپل کا پیڑ ——— اور لنگر خانہ ——— اس کے ذہن میں گھومنے لگا ——— لنگر خانہ اور پیپل کا پیڑ دونوں نے ساتھ دیا ۔ پر کتنی دیر ۔

بارش کی بوندوں میں ۔ اسے بھیّا اور ستّو کے رونے کی آوازیں سنائی دے رہی تھی جیسے وہ آہستہ آہستہ کہہ رہے ہوں " بھوک ——— بھوک ——— "

کتنا ضدی تھا بھیّا ذرا ذرا سی بات پر ایسا مچلتا تھا اور جب تک اپنی ہٹ پوری نہ کروا لیتا خاموش نہ ہوتا۔ پر اس دن تو وہ بھی نہ رویا کیسا نڈھال ہو رہا تھا ـــــــ بولا بھی نہ جاتا تھا۔

انھیں کے طرح کتنے مصیبت کے مارے سامنے پیڑوں کے نیچے، دکانوں کے سیڑھیوں کے قریب کھلی سڑکوں پر جہاں ایک پتا بھی اوپر نہ تھا۔ پانی میں بھیگ رہے تھے، دم توڑ رہے تھے۔ منہ کھلے ہوئے پھٹی پھٹی آنکھیں ننگے جسم ـــــــ اسے کتنی ہی لاشیں پڑی دکھائی دے رہی تھیں۔ وہ اپنے ہونٹوں کو دانتوں سے چبانے لگی۔ اس وقت اس کا جی چاہتا تھا کہ وہ خوب چیخ چیخ کر روئے، اس کا ماضی کیسا ہیبت ناک تھا، مگر آج بھی تو اس کے چاروں طرف اندھیرا ہی اندھیرا ہے اور وہ اس اندھیرے میں ہاتھ پیر مار رہی ہے، جوں جوں وہ سوچتی جاتی ہے اس کے سامنے ماضی کے ورق الٹتے چلے جاتے ہیں کھر کھر کھر ـــــــ

"منا مر گیا ـــــــ اور اب یہ بھی" ـــــــ ماں یہ کہہ کر انگلیوں سے زمین کریدنے لگی۔

"ماں! ـــــــ دیدی" ـــــــ بھیا کبھی کبھی آہستہ سے بولتا "بھوک" ـــــــ اب تو اس کی زبان بھی نہ دکھائی دیتی تھی۔ تالو کو چپک گئی تھی۔ ہاں ہرے ہرے جھاگ سے نکل رہے تھے۔ تھوڑی دیر پہلے اس نے درخت کے پتے چبائے تھے۔ دوسرا بھیا بھی پاس ہی کھڑا گھاس چبا رہا تھا۔ ماں

کے منہ میں بھی چھال کے ٹکڑے تھے جو منہ میں ادھر ادھر پھسل رہے تھے۔ اسے اچھے اچھے کھانوں سے نفرت سی ہونے لگی۔ وہ کیسے عمدہ عمدہ کھانے کھاتی ہے اور اس کے بھائی تڑپ تڑپ کر مرے۔ بھیا تو کیچڑ پانی میں لوٹ لوٹ کر ختم ہوا۔ رات کے اندھیرے میں تو پتا بھی نہ لگا کہ کس وقت دم نکلا۔

اس نے اپنی آنکھوں کو دونوں ہتھیلیوں سے بھینچ لیا۔ اف ان آنکھوں نے کیا کیا نہیں دیکھا، ہمارے قریب وہ عورت پڑی ہوئی تھی بھوکی دم توڑ رہی تھی اور اس کا بھوکا بچہ سوکھے ہوئے کھانگر جیسے سینہ سے چپٹا ہوا تھا۔ منہ سے خون بہہ بہہ کر گالوں پر آ رہا تھا۔ بھلا ہفتوں کی بھوکی ماں کے دودھ کہاں سے آتا جو کچھ جسم میں خون بچا تھا۔ اسی کو وہ چوس رہا تھا۔ اور بھی کتنے بچے پڑے تھے جن کے ہاتھ پیروں میں چلنے کی سکت باقی نہ رہی تھی۔ وہ بیٹھے بیٹھے مٹی پھانک رہے تھے ——— سامنے چاول کی دکانیں ہیں ——— ہے بھگوان یہ کیسا کال ہے۔ یہ بنئے تو نہیں سوکھے کیسے پھول رہے ہیں جیسے پھونک بھری ہو ——— چاول کی دکان چاول کے ڈھیر ——— اور پھر کھیت کے کھیت چاولوں سے بھرے ہوئے اس کی آنکھوں کے سامنے گھومنے لگے اور ان کھیتوں پر موٹی موٹی ٹڈیاں جیسے دھرتی پر کالے بادل چھائے ہوں۔

——— "ان دکانوں میں کتنا بہت سا چاول بھرا ہوگا بٹیا!"

ماں نے کہا۔ پر ہمیں چاول کون دیدے گا۔ یہ دوکاندار بھی کتنے بے رحم ہیں۔ بچوں

کو بھی تو ایک مٹھی چاول نہیں دیتے۔ بھگوان کیا ان کے بچے نہ ہوں گے۔ پر ان کے بچے بھی ایسے ہی موٹے تازے ہوں گے۔ خوب رکابی بھر بھر کر چاول کھاتے ہوں گے۔ ایشور نے انھیں پیسہ دیا ہے پھر کیوں نہ کھائیں۔

"چاول ــــــ چاول ــــــ" آہستہ آہستہ وہ کہہ رہی تھی، جیسے کئی دن سے اسے کھانے کو نہیں ملا۔ اسے بھوک لگ رہی ہو، ایک مٹھی چاول مل جاتا تو بھیا کی جان بچ جاتی۔ پہ چاول تو سونے کے بھاؤ ہے۔

"جب تارو کو چپکی جا رہی ہے بھگوان" ــــــ ماں نے زبردستی زبان کو ہونٹوں پہ پھیرا۔ "تارہ تو بھوکی ہو گی ــــــ میں کیا کروں یہ بچے بھی تو بھوکے مر جائیں گے ــــــ ہاں سب ہی مر جائیں گے۔"

ماں کی آواز تارہ کے کانوں میں گونجنے لگی جیسے وہ وہیں بیٹھی ہو اور کہہ رہی ہو۔ "ہاں سب ہی مر جائیں گے" ــــــ ماں مر جائے گی، بھیا مر جائیں گے اے بھگوان، پھر میں کیسے زندہ رہوں گی۔ اس سنسار میں کوئی اکیلا بھی جی سکتا ہے۔

وہ چونک پڑی۔ وہ اب اکیلی تھی ــــــ دادا، ماں، بھیا کوئی بھی تو اب نہ تھا۔ یوں تو اس سے پریم کرنے والوں کی گنتی بھی نہ ہو سکتی تھی۔ پر وہ تھی اکیلی اس کا کوئی بھی نہ تھا۔ جس محل کی وہ رانی تھی وہ محل اُسے سنسان دکھائی دے رہا تھا۔ ہمارا گھر تھا تو کچا چھپر پڑا ہوا، پر اس میں کتنی رونق تھی بھیا کیسا شور مچایا کرتے تھے اور چاچی تو سارے دن ہنسی مذاق کرتی رہتی تھی۔ ماں

کو بھی ہنسی ہنسی میں کیسا تنگ کرتی تھیں۔ پر سب ہی اس کی باتوں پر ہنستے تھے۔ کیسے سکھ کے دن تھے وہ بھی ——— ہائے رام۔

اس کے دماغ میں خیالات کے انجن سے چل رہے تھے، اور وہ اپنے ماضی کو جو ہزاروں من مٹی کے نیچے دبا ہوا تھا کرید رہی تھی

"تارہ!" ماں نے اپنا سوکھا ہوا ہات میرے کندھے پر رکھ دیا

"کیا ہے؟" میں نے پوچھا۔

"تجھ سے چلا جائیگا بٹیا؟ ——— اس سامنے والے محل میں شاید پاؤ ڈیڑھ پاؤ چاول مل جاتا"

"پر ماں تجھ سے کیسے چلا جائے"

"میں بھی چلوں گی" ——— وہ زمین سے ہات ٹیک کر آہستہ آہستہ کھڑی ہو گئی، ایک قدم آگے بڑھایا۔ سر چکرایا۔ اور وہ وہیں منہ کے بل گر پڑی ——— کتنے دن کھائے ہوئے ہو گئے تھے۔ چلنے کی طاقت کہاں تھی

ہم تو مر ہی جائیں گے بٹیا، پر تیرا سہارا ہو جاتا۔ ہائے اولاد کی ممتا وہ پھر اٹھ کھڑی ہوئی اور چلنے لگی

منا مر گیا تھا، بھیا بھی مر گیا اور اب بھورو کو چار کیلے اور پاؤ چاول دیکر ایک بنیا لے گیا۔ آج اسے گئے ہوئے بھی دو دن ہو گئے۔ ہائے بھوک۔ ماں نے چار کیلے اور پاؤ چاول کے لئے اپنے لال کو بیچ دیا۔ پر وہ زندہ تو رہیگا

اس کی آنکھوں کے سامنے بھیا گھومنے لگا ۔ موٹا تازہ ــــــ اس کے سامنے کتنا بھات رکھا ہوا ہے اور وہ خوش ہو ہو کر کھا رہا ہے ــــــ اب اس کے پچکے ہوئے گال بھی پھول گئے تھے ۔ کیسا اچھا لگ رہا ہے بھیا ۔

"میں نے اپنے بچے کو بیچ دیا ــــــ اب وہ زندہ تو رہے گا ۔ یہاں ہوتا تو وہ بھی اب تک ؟ ــــــ ماں کہتے کہتے چپ ہو گئی ۔ شاید اسے خیال آ گیا کہ وہ اپنے بچے کو کوس رہی ہے وہ پھر بولی

"جئے گا تو کبھی نہ کبھی آکر اپنے گھر کا چراغ جلائے گا۔"

"محل کا دروازہ تو بند ہے ماں!" نہ جانے کیوں خود بخود مجھے ڈر معلوم ہو رہا تھا ۔ پر میں بھی ماں کے ساتھ وہیں ڈیوڑھی پر بیٹھ گئی ۔ اب اندر کیسے جایا جاتا معلوم نہیں کوئی کیا سمجھے ۔ دروازہ بھی نہیں کھٹکھٹایا جا سکتا

تارہ کے کانوں میں موٹر گاڑیوں کی گھڑگھڑاہٹ سنائی دینے لگی اور وہ محل کا بڑا دروازہ جہاں وہ بیٹھی تھی ، سامنے سے تانگہ لاریاں گزر رہی تھیں ، پھلوں والے پھلوں کے ٹوکرے سر پر رکھے چلے جا رہے تھے ، پیلے پیلے کیلے ، سرخ سرخ انار ، ایک انار مل جاتا تو کتنا اچھا ہوتا ــــــ یا دو کیلے ہی دے دیتا ۔ پر پیسہ بغیر کیوں دے دے گا ــــــ یہ موٹر تانگوں میں کتنے لوگ جا رہے ہیں ۔ ان کے پاس تو پیسے ہوں گے ــــــ چار پیسے ہم بھوکے ہیں" ــــــ الفاظ منہ تک آئے پھر رک گئے ، جیسے

کسی نے گلا دبا دیا ہو۔ ہاتوں نے جنبش کی پر اٹھ نہ سکے۔ بھوکے تھے، لیکن آج تک کسی کے سامنے ہاتھ نہ اٹھا۔ اتنے آدمی جا رہے ہیں کوئی پیسہ دو پیسہ تو دے ہی دیتا ــــــــ بھگوان کے نام پہ اپنے بچوں کی خیرات۔

"یہاں کیوں بیٹھی ہو؟ ــــــــ چوری کرنے آئی ہو"

سامنے ایک آدمی کھڑا ہوا چلّا رہا تھا، اسکا دل دھک دھک کرنے لگا اور ماں کی آنکھیں کیسی ہل رہی تھیں جیسے کٹوری میں پانی۔ "اس کال نے بھی مصیبت کر دی دن ڈہارے لوگ چاہتے ہیں کہ آنکھوں میں دھول جھونک کر سب لوٹ لے جائیں ــــــــ پولیس کے حوالے کر دوں گا۔ حوالات میں بند ہو جاؤ گی؟"

"ہم چور نہیں ہیں بھیّا" ــــــــ ماں بولی

"کون ہے" ــــــــ ایک عورت نے کھڑکی سے سر باہر نکال کر دیکھا۔

"تم کون ہو؟"

"ہم بھوکے ہیں، ــــــــ ایک نوالا چاول ــــــــ" ماں کی آنکھیں چمک گئیں۔ کیسی آن تھی جو اب تک بھوک پر غالب تھی۔

"اچھا میں تمھیں کھانے کو دوں گی ــــــــ معلوم نہیں کب کی بھوکی ہیں"

کتنی اچھی ہے یہ عورت" ——— ماں بولی۔

وہ آدمی بھی کتنا رحم دل تھا جو بھورو کو لے گیا ہے۔ اس نے ہمیں چار

کیلے اور پاؤ بھر چاول دیئے تھے ——— معلوم نہیں بھورو کہاں ہوگا۔

اس آدمی کا گھر بھی تو ہمیں معلوم نہیں

"لو بھات لو" ——— اس عورت نے بھات سے بھری ہوئی

رکابی ہمارے ہات میں دیدی ——— گرم گرم بھات ———

خوشبو دماغ کو چڑھنے لگے۔ آج کتنے دن کے بعد پیٹ بھر کھانے کو ملا۔

کتنی اچھی ہے یہ عورت اتنا بہت سا چاول مفت لاکر دیدیا۔ کیسے گرم گرم چاول

ہیں۔

"بڑی بی! یہ تمھاری لڑکی ہے۔ بڑی سندر ہے"

"ہاں ہاں ——— تین بچے اور بھی تھے"

ماں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر آسمان کی طرف دیکھنے لگی

"دو بھگوان نے لے لیے ——— ایک کو بیچ دیا"

"لڑکی کا رنگ کیسا پیلا پڑ گیا ہے"

"کھانے ہی کو نہیں ملتا تو رنگ روپ کہاں۔ آج آٹھواں دن بعد پیٹ

بھر ملا ہے۔ اب تو چاول سونے کے بھاؤ ہو گیا۔ غریبوں کو اب بھات بھی

نہیں ملتا۔

تارہ کی نظریں دو باولوں میں بھٹک رہی تھیں اور اس کے دماغ میں چاولوں کی خوشبو بسی ہوئی تھی، تین دن کی بھوکی جب اسے چاول ملے تو جان سی آئی ——— وہ عورت کیسی رحمدل تھی، ہماری بپتا سن کر اس کی آنکھیں بھی بھر آئی تھیں۔ اور پھر اس نے مجھے اپنے پاس رکھ لیا۔ ماں کو بہتیرا روکا، پر اس نے ایک نہ مانی اور چلی گئی ——— بھگوان جانے اب کہاں ہو۔

کھٹ۔ کھٹ۔

تارہ چونک پڑی۔

"کون ہے؟" تارہ نے پوچھا۔

"شام ہو گئی۔ کتنی دیر سے تمہارے مہمان بیٹھے تمہارا انتظار کر رہے ہیں۔"

"یہ وہی تارہ کی مہربان مالکہ تھی جس نے کچھ چاول دیکر اسے خریدا تھا۔ تارہ کی آنکھوں کے سامنے آگ کی لپٹیں سی اٹھنے لگیں جیسے اس کا ماضی جل رہا ہو۔ ڈر ڈر ڈر ———

تارہ کا دماغ پراگندہ ہو چکا تھا، اس کا ماضی اس کے حال سے ٹکرا کر کبھی جیت نہیں سکتا۔ اس کے کانوں میں ایک بھاری آواز گونج رہی تھی، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جیسے کوئی آندھی میں بول رہا ہو "ہم نے ایسی رنڈیاں نہیں دیکھی ہیں کہ جو دن رات یوں ہی کمرہ بند کئے پڑی رہیں۔ رنڈیوں کے یہ دستور نہیں ہوتے ———"

گلابی کی نذر

جب چاند کی حسین اور نازک کرنیں اپنے کو دریا کی آغوش میں چھپانے لگتی ہیں، جب کائنات چاند کی سیمیں چادر میں ملفوف ہو کر خاموش ہو جاتی ہے جب بادِ نسیم گلشن میں عطر بیز ہوتی ہے وہ رات ——— ہاں وہ شعریت میں ڈوبی ہوئی رات کیا ہوتی ہے؟ شاید کسی مطربہ کا ترنم یا کسی پری پیکر دوشیزہ کی ایک مسکراہٹ۔

ایک ایسی ہی رومانی رات تھی، ندی کی شوخ و چنچل موجیں ساحل سے ٹکرا

ٹکرا کر ہلکا ہلکا ترنم پیدا کر رہی تھی ۔ چادرِ فلک پہ چاند کے گرد ستارے کچھ عجیب بے ترتیبی سے منتشر تھے ۔

غزالہ ایک لمحہ کے لئے رکی اس نے ہر چہار طرف نظر ڈالی اور پھر اس کی معصوم نگاہیں ندی کے چمکدار لہروں پر جم کر رہ گئیں ، کیا صحرا کے ان آزاد دلرباؤں نے ان سحر طراز موجوں نے غزالہ کے امنگوں بھرے دل کو موہ لیا ؟ ۔ ہاں شاید ہر دیکھنے والے نے یہی اندازہ لگایا ہوگا ۔ اور لوگوں کا یہ نظریہ ایک حد تک درست بھی تھا ۔ کیونکہ غزالہ جوان تھی ، خوبصورت تھی ۔ اس کی نگاہوں میں سحر تھا جو فضا کو رنگین سے رنگین تر بنا رہا تھا ۔ مگر گہرائی پہ نظر رکھنے والے اچھی طرح سمجھ سکتے تھے کہ اس کی مسکراہٹ ایک حقارت آمیز مسکراہٹ تھی ۔ اس کا دل ڈوبا ہوا تھا ۔ جیسے کنول کے ساغرِ نمیں میں شبنم کے آنسو ، وہ نہ صحرا کے ان آزاد دلرباؤں کو دیکھ رہی تھی اور نہ ندی کی شوخ و چنچل موجوں کو بلکہ وہ سیمیں اوراق پر اپنی زندگی کی دردناک کہانی دہرا رہی تھی اور اس کے پرحسرت انجام کو سمجھنے کی کوشش کر رہی تھی ۔۔۔

۔۔۔۔۔۔ دور درخت پہ پپیہا چلایا ۔۔۔۔۔۔

" کیا تیرا پی تیرے پاس نہیں ہے ؟ "

یہ نغمہ فضا میں گونجا اور چند لمحہ بعد ہر طرف پہلی سی خاموشی چھا گئی ۔۔۔۔۔

غزالہ نے اپنے کان بند کر لئے ۔ اس کے دل میں یہ الفاظ سننے کی تاب نہ تھی اس کی آنکھوں سے آنسوؤں کے چند قطرے رخساروں پہ بہنے لگے وہ آہستہ سے

قدم اٹھاتی ہوئی ایک طرف کو چل دی۔

کوئی دس سال کا طویل عرصہ گزرا انھیں دنوں ایک ایسی رومانی رات تھی۔ جبکہ حامد نے غزالہ کو پہلی بار دیکھا اور پہلی ہی نظر میں ہوش و حواس کھو بیٹھا۔ ———— گو یہ دونوں خالہ زاد بھائی بہن تھے۔ لیکن آج سے پہلے کبھی ایک دوسرے کو نہ دیکھا تھا، تاہم غزالہ حامد کی معاشرت سے بخوبی واقف تھی، وہ جانتی تھی کہ حامد ایک شرابی من چلا آوارہ گرد انسان ہے۔ اس کے عشرت کدہ میں عورت ایک کھلونے سے زیادہ وقعت نہیں رکھتی۔ جس طرح ڈرائنگ روم میں ایک خوش نما گلدستہ یا کسی عین تصویر کو چار روز دیکھنے کے بعد ہماری نظریں سیر ہو جاتی ہیں بالکل اسی طرح انسانیت اور شرافت کا دشمن شرابی، شراب، کباب اور حسن کا شیدائی رہتا ہے وہ عورت کو اپنا شریک حیات تصور نہیں کرتا بلکہ اس کو صرف ایک آلۂ تفریح خیال کرتا ہے اور ہمیشہ اپنے عشرت خانہ میں ایک نیا مرمریں مجسمہ دیکھنا چاہتا ہے مگر ———— غزالہ ایک ہندوستانی عورت تھی جس کو زبان ہلانے تک کا حق نہ تھا۔ اس نے اپنی تمناؤں اور آرزؤں کو دوسروں کی خوشی پر قربان کر دیا ———— اپنے جذبات کو غم کے ہاتھوں سے تھپک تھپک کر ہمیشہ کے لئے سلا دیا ————

خزاں کی ایک اداس اور سنسان شام تھی۔ عروس شب کے پتے گرم ہوا کے تھپیڑوں سے مرجھا گئے تھے۔ چنبیلی کی نازک ٹہنیاں سطح زمین پر لوٹ رہی تھیں۔ غزالہ کی بہار زندگی پر بھی خزاں مسلط ہو چکی تھی۔ اس کی تمناؤں اور آرزوؤں کا آفتاب غروب ہو چکا تھا۔ اس کی خوشی اور مسرت کے آسمان پر گھنگھور گھٹائیں چھا چکی تھیں۔ اس کی تمام جائداد اور روپیہ جام و صراحی کی نذر ہو چکا تھا، وہ اپنی امیدوں کا خون ہوتے ہوئے خود اپنی آنکھوں سے دیکھ رہی تھی، لیکن زبان نہ ہلا سکتی تھی۔

غزالہ کی نظریں زمین پر جھکی ہوئی تھیں۔ آنسو اس کی آنکھوں سے جاری تھے جو اس کی رخساروں کی بارگاہ حسن میں سجدہ ریز ہو کر چمکیلی ریت میں جذب ہو جاتے۔

"اے دنیا کے مالک، بیکس و مظلوموں کی فریاد سننے والے خدا میری بھی ایک استدعا ہے ——— سن اس کو بھی سن لے ——— میرے سرتاج کی اس طرز زندگی کو بدل دے۔ مجھ سے اب ان کی ایسی حسرتناک زندگی نہیں دیکھی جاتی، شراب جس کو وہ آب کوثر سمجھتے ہیں ان کے لئے تندرستی کے لئے زہر ہلاہل ہے ——— ہائے کبھی ان کا جسم ہاتھ پیر ایسے تندرست اور خوبصورت تھے کہ بس یہی جی چاہتا تھا کہ ہر وقت دیکھا ہی کرے مگر اب اس منحوس شے کی بدولت کون کہہ سکتا ہے کہ یہ وہی ہیں، چہرہ پر صدہا جھریاں پڑ گئی ہیں۔ وقت سے پہلے موت ان کو آدبوچنے کی کوشش میں ہے

سوسائٹی میں لوگ ان کو نفرت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ ہر ایک ان کی صحبت سے بچتا ہے۔ عورتیں مجھے طعنہ دیتی ہیں کہ "تیرا شوہر شرابی ہے"۔ —— آوارہ ہے۔ بدمعاش ہے —— اس لئے تو ابھی اس لائق نہیں کہ ہم لوگوں کے پاس بیٹھے"۔ —— اے خدا کیا ان کی وجہ سے میں بھی اس قدر ذلیل ہوں؟ —— ہاں سچ ہے۔ میں ذلیل ہوں "کند ہم جنس باہم جنس پرواز" اگر میں ایسی ذلیل اور بدبخت نہ ہوتی تو کیوں ان کی شریک حیات بنادی جاتی —— شراب ان کو جہنم کے دہکتے ہوئے شعلوں کی طرف کھینچ رہی ہے —— اس نے ان کو گناہ کے اس تاریک غار میں ڈھکیل دیا ہے جس کی سنگین دیواروں کی ٹکر انسانی زندگی کو پاش پاش کر دیتی ہے۔ اے مصیبت زدوں کی امداد کرنے والے کیا اس نازک وقت پر تو میری مدد نہ کرے گا۔

"غزالہ ——!"

ایک گرجدار آواز نے اس کے خیالات کا تسلسل توڑ دیا۔ اس نے اپنی ڈبڈبائی ہوئی آنکھیں اوپر کو اٹھائیں —— "میرے سرتاج!" —— یہ کہہ کر وہ کھڑی ہو گئی، حامد شراب کے نشے میں چور چارپائی پر گر پڑا ——

"ہاہاہا —— ہاہاہا —— شراب کے بادل جھوم رہے ہیں۔ شراب کی ہوائیں چل رہی ہیں۔ ہر چیز میں شراب ہی شراب ہے کیسا اچھا سماں ہے۔ شراب کو میں نے پیا اور شراب نے مجھے پیا! ——

غزالہ! ـــــــ تم بھی مجسم شراب ہو آؤ میں تمہیں پی لوں" ـــــــ

"میرے سرتاج اپنی حالت کو سنبھالو ـــــــ دیکھو تمہارا لاکھ کا گھران رنگین بوتلوں کی خاطر خاک ہو گیا۔ یہ گھر جو اعلیٰ سے اعلیٰ ساز و سامان سے مزین تھا بہترین قالین ان کمروں کی زینت تھے۔ طرح طرح کے رنگین جھاڑ فانوس اور برقی قمقموں کی روشنی سے ہر وقت جگمگ جگمگ کرتے رہتے تھے۔ لوگ ہمارے اس ساز و سامان اور عیش و عشرت پر رشک کرتے تھے لیکن آج میرے مالک! اس منحوس شراب کی بدولت اس گھر میں حسرت برس رہی ہے، ہم محتاج ہیں، غریب ہیں، دوسروں کے دست نگر ہیں"۔

"غزالہ! تو کیا بک رہی ہے۔ تو ایک ایسی نعمت کی برائی کر کے میری توہین کر رہی ہے ہاہاہا ـــــــ شراب ـــــــ غزالہ لاؤ ـــــــ ایک جام اور لاؤ ـــــــ شراب ہی میرا ایمان ہے۔ شراب ہی میرا خدا ہے"۔

"میرے سرتاج کیا میری قسمت میں تمہارے کوڑوں کی مار اور آنسوؤں کے سوا کچھ بھی نہیں"۔ غزالہ کا کمزور جسم غم و غصہ سے لرز رہا تھا۔

"کوڑوں کی مار اور آنسو ـــــــ ہاہاہا ـــــــ تم بھی کیسی خوش قسمت ہو"۔

"خدا کے واسطے تم شراب پینا چھوڑ دو۔ اور اپنی حالت پر رحم کرو۔ شراب کیسی بری چیز ہے۔ گھر بار، دھن، دولت کا تو اب ذکر ہی کرنا فضول ہے لیکن تمہاری تندرستی بھی تو عزیز ہے، اس سے پھیپھڑے خراب ہو جاتے ہیں، انسان وقت سے پہلے موت کی

آغوش میں ابدی نیند سو جاتا ہے۔

"تو کیا اس کا مطلب یہ ہے کہ میں شراب پینا چھوڑ دوں —— بس زیادہ بکو اس کی ضرورت نہیں جلدی ایک جام لاؤ" ——

"ایک جام! —— میرے پاس تو کچھ بھی نہیں۔ میں کہاں سے لاؤں"

"ایک جام بھی نہیں —— خیر جانے دو مجھے روپیہ دو میں خود منگا لونگا"

"روپیہ! —— میرے پاس تو پھوٹی کوڑی بھی نہیں" —— اس کی نگاہیں حامد پر جم کر رہ گئیں۔

"مجھے کیا گھور رہی ہو، جلدی روپیہ لاؤ"

"روپیہ! ——" اس کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ گھر کی حالت آپ سے چھپی نہیں جو کچھ تھا وہ رنگین بوتلوں کی نذر ہو گیا۔ آج صبح سے مجھے روکھی روٹی بھی میسر نہیں ہوئی"

"نہ ہوئی ہو گی، میں تمہارا کوئی ٹھیکیدار ہوں"

"ہو یا نہ ہو جب میرے پاس کچھ ہے ہی نہیں تو کہاں سے دیدوں"

غزالہ کی آنکھوں سے غم و الم کی لپٹیں نکلنے لگیں جو اپنی گرمی سے گناہوں کی دنیا پھونک دینا چاہتی تھیں۔

"کیوں نہیں ہے؟ —— اور اگر نہیں ہے تو تم کو پیدا کرنا ہوگا ——

"کہاں سے پیدا کروں اب تو کوئی قرض بھی نہیں دیتا"

"دے یا نہ دے، کچھ بھی ہو، چوری کرو، ڈاکہ ڈالو، بھیک مانگو۔"

غزالہ نے نگاہیں اوپر اٹھائیں۔ اس کا پیمانہ صبر لبریز ہو چکا تھا۔ اس نے تیز نظروں سے حامد کی طرف دیکھا۔

"چوری کروں ——— ڈاکہ ڈالوں ——— یہ کہتے ہوئے آپ کو شرم نہیں آتی۔ آپ کی وجہ سے میں دنیا میں ذلیل و خوار ہوں ——— تاہم میری رگوں میں شرافت کا خون ہے ——— میں اس زندگی سے بھاگنا چاہتا ہوں۔ ——— موت" ——— اس کی آواز بھرّا گئی اور آگے بول نہ سکی ———

"موت! ——— ارے غزالہ! یہ کن صاحب کا نام ہے۔ اچھا پھر انہیں سے روپیہ لے دو۔"

غزالہ چپ رہی اور سسکیاں لے لے کر رونے لگی۔

"غزالہ" ——— حامد نے گرجدار آواز میں پکارا ——— میں اتنی دیر سے بھونک رہا ہوں، مگر ابھی تک روپیہ نہیں آیا ——— شام ہو گئی ہے۔ اگر مجھے ایک منٹ کے اندر اندر روپیہ نہ ملا تو یاد رہے کہ تیری خیر نہیں۔"

"آپ کو اختیار ہے جو جی میں آئے کریں مگر میرے پاس تو کچھ بھی نہیں۔"

یہ سنتے ہی حامد کا چہرہ تمتما اٹھا ——— اس کے ہات میں ایک لکڑی تھی وہ اٹھا اور غزالہ کو مارنے کے لئے لپٹ پڑا۔

کیسا حسرت ناک منظر تھا، غزالہ کی دردناک چیخوں سے زمین اور آسمان لرز رہے

تھے۔ اس کا سر جھک آیا اور وہ وہیں زمین پر گر پڑی۔ اس کے جسم کا ہر عضو زخمی ہو چکا تھا۔ سر سے خون بہہ رہا تھا ——

حامد نے غزالہ کو دیکھا اور ایک قہقہہ لگایا —— اس کے چہرے سے دہشت ٹپک رہی تھی —— اور پھر وہ دیوانہ وار دروازے سے نکل گیا۔

آفتاب غروب ہو چکا تھا، لیلائے شب نے تمام عالم کو اپنے دراز گیسوؤں میں لپیٹ لیا تھا۔ آسمان پر تاروں کی انجمن آراستہ ہو رہی تھی، ہر طرف بلا کی خاموشی چھائی ہوئی تھی، اس وقت آوارہ گرد حامد بازار کی جانب جانے والی سڑک پر لڑکھڑاتا ہوا جا رہا تھا —— کپڑے پھٹے ہوئے تھے اگرد آلود چہرے سے دہشت ٹپک رہی تھی —— اور معلوم نہیں کیا کیا بڑبڑا رہا تھا۔

اے کاش حامد کی طرح اپنی قیمتی زندگیوں کو جام و صراحی کی نذر کرنے والے اپنی آنکھوں سے غفلت کا پردہ ہٹا کر دیکھیں تو معلوم ہو گا کہ شراب کے گلابی پردے کے پیچھے ان کی تباہی کی حسرت انگیز داستانیں چھپی ہوئی ہیں —— اور جام و صراحی کی جھنکار آنے والی پرخطر زندگی کا پیغام سناتی ہے۔ لیکن وہ بہرے ہیں —— ان کے کان ان باتوں کے سننے کی استعداد نہیں رکھتے۔

حامد فیروزہ بائی کے دروازہ پر پہنچ کر رک گیا —— چند لمحہ کچھ سوچتا رہا

پھر آہستہ سے دروازہ کھول کر اندر داخل ہوا۔ فیروزہ قد آدم آئینہ کے سامنے کھڑی بال سنوار رہی تھی۔ کمرہ برقی قمقموں سے جگمگا رہا تھا۔ بجلی کی سفید روشنی میں میز پر رکھی ہوئی رنگین بوتلیں عجیب کیف پیدا کر رہی تھیں —— حامد شراب کے نشے میں مدہوش آ کر فرش پر گر پڑا —— فیروزہ چونک پڑی، اس نے مڑ کر دیکھا "کون ہے" اس کی پیشانی پر شکنیں پڑ گئیں —— اس نے بال سنوارتے ہوئے حقارت آمیز لہجہ میں کہا۔

"حامد! —— میں تم سے کتنی بار کہہ چکی ہوں کہ تم یہاں نہ آیا کرو، اب تم مجھ سے پریم کرنے کے لائق نہیں ہو —— یہاں انسان سے نہیں بلکہ سیمیں سکوں سے پریم کیا جاتا ہے۔ جب تک وہ تمہارے پاس تھے مجھے تم سے پریم تھا، مگر اب میری نظروں میں تمہاری کوئی قدر و قیمت نہیں۔"

"فیروزہ! اس وقت میری نظروں میں دنیا کوئی حقیقت نہیں رکھتی۔ جب کہ میرے سامنے یہ رنگین بوتلیں رکھی ہوئی ہیں —— چلو فیروزہ ایک جام!"

"مجھے افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے" —— فیروزہ نے کرسی پر بیٹھتے ہوئے کہا۔ "اب تم اس کے حق دار نہیں ہو۔"

"میں حقدار نہیں —— کیا کہا فیروزہ؟" حامد نے دیوانوں کی طرح فیروزہ کو تکتے ہوئے کہا۔

"ہاں! اب تم اس کے حقدار نہیں ہو۔ یہ تو ان کا حق ہے۔ جن کے پاس دھن دولت ہے تم جیسا مفلس انسان ان کا خریدار نہیں بن سکتا"۔ فیروزہ نے کرخت لہجہ میں جواب دیا

"فیروزہ! تم مجھے مفلس کہہ کر میری توہین کر رہی ہو اگر آیندہ اس قسم کے الفاظ کہے تو پچھتانا پڑے گا"۔ —— حامد غصہ میں کانپ رہا تھا۔

"میں کچھ سننا پسند نہیں کرتی" فیروزہ نے ترش روئی سے جواب دیا۔ "تم رئیس ہو یا مفلس، بہرکیف میں کہتی ہوں کہ آیندہ تم یہاں نظر نہ آؤ گے"۔

"بس فیروزہ بہت ہو گئی —— اب بکواس کی ضرورت نہیں، ورنہ یاد رہے کہ بہت پچھتاؤ گی

"دیکھا جائے گا" —— یہ کہہ کر فیروزہ چپ ہو رہی —— اور پھر گرج کر بولی —— "لیکن میں ایک لمحہ بھی اب تم کو یہاں دیکھنا نہیں چاہتی" ——

"اچھا فیروزہ تیری ان گستاخیوں کی سزا تجھے ابھی دیتا ہوں" —— یہ کہہ کر حامد نے جیب سے پستول نکالا —— کمرہ میں ایک زور کا دھماکہ ہوا اور ایک دل سوز چیخ کے ساتھ فیروزہ کا جسم زمین پر تڑپنے لگا۔ حامد نے نیم مردہ لاش کو بغور دیکھا اور ایک وحشت ناک قہقہہ لگایا

عزالہ بدستور آہستہ آہستہ چلی جا رہی تھی، گزرے ہوئے واقعات اس کی آنکھوں

کے سائے چھائے ہوئے تھے ——— اس کا گھربار دھن دولت ——— سب ہی تو گلابی کی نذر ہو چکا تھا ——— حتیٰ کہ خود حامد کی زندگی بھی اس کی بھینٹ چڑھ گئی ——— اس کو پھانسی دیدی گئی ———

غزالہ کی آنکھیں ساون بھادوں کی طرح برس رہی تھی ——— اس کو چاند کی حسین کرنیں مغموم دکھائی دے رہی تھیں، جب ہوا کے جھونکوں سے درخت کی نازک نازک ٹہنیاں جھومتیں تو وہ ایسا محسوس کرتی گویا وہ بھی اس کی غمناک زندگی پہ نوحہ کناں تھیں ——— وہ پھر رکی ——— اُس نے آسمان کی جانب ایک حقارت آمیز نظر ڈالی، اور پھر آہستہ آہستہ چلنے لگی۔

وہ کہاں اور کدھر جا رہی تھی یہ کوئی نہ جانتا تھا ——— اتنے میں دوبارہ پپیہا دلدوز آواز میں چلایا ——— "کیا تیرا پی تیرے پاس نہیں ہے"؟

اور پھر چند لمحہ بعد ہر طرف وہی پہلی سی خاموشی چھا گئی، غزالہ سامنے وہاں ——— بہت دور ——— افق کے پار بلند قامت پہاڑوں اور سرسبز درختوں کے سائے میں دنیا کی نظروں سے اوجھل ہوگئی۔

چاند بدستور اپنی حسین روپہلی کرنیں ندی کی شفاف لہروں پر نچھاور کر رہا تھا ——— ندی کی شوخ و چنچل موجیں اب بھی ساحل سے ٹکرا ٹکرا کر ہلکا ہلکا ترنم پیدا کر رہی تھیں۔ (باجازت بورڈ امتناع مسکرات بمبئی ۱۹۲۹ء)

لال کرتا

شام ہو چکی تھی ۔ رامو کے قدم آہستہ آہستہ گھر کی طرف اٹھ رہے تھے ، جیسے کسی نے پیروں کی جان کھینچ لی ہو ۔ ایک قدم بھی تو آگے کو نہ بڑھتا تھا ۔ وہ کتنا جلدی جلدی چلنا چاہتا تھا ۔ پر ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے سارا بدن تھک کر چور ہو گیا ہو ۔ آج تو مل میں کام بھی زیادہ نہ ہوا تھا پر بدن میں اتنی دکھن کیوں ہے ، رات سے کچھ کھایا بھی تو نہ تھا ۔ اسے اپنے بچوں کا خیال آ گیا ۔ ہائے وہ بھوکے ہوں گے ، وہ اس کا انتظار کر رہے ہوں گے ۔ رات سے انھیں بھی تو کچھ کھانے کو نہ ملا ——— بچے تو یوں دن میں کئی کئی دفعہ کھاتے ہیں ——— اسے اپنے اوپر ہنسی آئی ۔

وہ غریب آدمی ہے ایک وقت بھی اگر کھانے کو مل جائے تو بہت ہے۔ دن میں کئی دفعہ ——— ہاں کھاتے ہوں گے امیروں کے بچے۔ ان کا کیا ہے وہ تو طرح طرح کی پھل پھلواری سب ہی کھاتے ہیں جب ہی تو اتنے موٹے تازے ہوتے ہیں، جیسے غبارہ پھولا ہوا اب دیکھو سیٹھ جی کا للو جب تک بیٹھا رہتا ہے کچھ نہ کچھ کھاتا ہی رہتا ہے۔ کپڑے بھی کیسے بڑھیا پہنے رہتا ہے ——— کپڑوں کا خیال آتے ہی اسے اپنی روپا یاد آگئی، کتنے دن ہو گئے۔ انھیں دنوں میں روپا نے لال کرتے کے لئے کہا تھا! اور اب دوسری ہولی آگئی، پر اس کے لئے لال کرتا نہ لا سکا۔ بھگوان اسے بھی پیسہ دیتا تو کیا وہ اپنے بچوں کو سیٹھ کے بچوں سے کم رکھتا وہ بھی ایسی ہی اچھی اچھی چیزیں کھلاتا اور بڑھیا کپڑے پہناتا، راموکو اپنے اوپر ہنسی آئی ——— ہنک ——— میں بھی کیسی باتیں سوچتا ہوں کہاں سیٹھ جی اور کہاں ہم غریب مزدور، ہم تو ان کی پیر کے جوتی کے برابر بھی نہیں ہیں وہ تو بڑے آدمی ہیں، کتنی ملیں چل رہی ہیں گھر میں سونا ہی سونا بھرا پڑا ہے اور یہاں کیا دھرا ہے ہوتا تو دیوالی کے روز بھی بچی پھٹا کرتا پہنے پھرتی، پر ان امیروں کے کتنی ہی دولت ہو غریبوں کو پھر بھی چین نہیں لینے دیتے۔ انھیں رحم کیوں نہیں آتا۔ راموکو ان امیروں سے نفرت سی ہونے لگی۔ اس سے تو غریب ہی اچھے ہوتے ہیں، کسی پر ظلم تو نہیں کرتے۔ اب دیکھو اتنا بڑا آدمی ہے۔ پر مزدوروں کو وہی آٹھ آنے روز ملتے ہیں اور کام تو اتنا بھاری ہے کہ کلیجہ پھٹ پھٹ جاتا ہے۔ اسے

بھگوان تو نے امیروں کو دل بھی تو پتھر کا دیا ہے، اس کی آنکھوں کے سامنے مل کی عمارت آگئی، لوہے کی مشین، مزدور، اور سیٹھ بیٹھا ہوا دیکھ رہا ہے اور مشین چل رہی ہے۔

"نندو! ——— نندو!" ——— اس کی زبان سے نکلا۔ بچارا آج ختم ہو گیا، ذرا سی دیر پہلے اچھا خاصہ تھا۔ پر دو گھڑی میں مشین نے کچل کے دھر دیا۔ کوئی ہڈی بھی تو ثابت نہ رہی تھی اور گوشت تو جیسے کسی نے پیس دیا ہو۔ مشین تھی بھی تو کتنی بھاری اور یہ سیٹھ کتنا بدماش ہے دور بیٹھا بیٹھا دیکھتا رہا وہ تو مشین کی گرنے کی آواز سے سب دوڑ پڑے پر سیٹھ تو اپنی جگہ سے ہلا تک نہیں، اور الٹا ہم لوگوں کو ڈانٹنے لگا ——— بدماش کہیں کا بڑا بنتا ہے رہیس ——— اور باتیں کیسی میٹھی میٹھی کرتا ہے جیسے اس سے جیادہ ہمارا اور کون ہو سکتا ہے۔

نندو کی لاش ——— گوشت کے پارچے اس کی نظروں کے سامنے آنے لگے اور دھیرے دھیرے اس کی تعداد بڑھتی چلی گئی ——— اونہ ——— وہ چلتے چلتے رک گیا۔ اسے ایسا معلوم ہوا جیسے کوئی لاش ہے، نندو خون میں لت پت سڑک پر پڑا ہوا ہے۔ "نندو" ——— اس کی زبان سے بیساختہ نکل گیا۔ اس نے پھر چلنا شروع کر دیا۔ رامو نے اپنی آنکھیں چیریں، وہ سب کچھ بھول جانا چاہتا تھا، پر نندو کی لاش اس کے ذہن سے نہیں اترتی تھی، لوہے

کے بڑے بڑے کندے سڑک پر چلتے ہوئے معلوم ہونے لگے۔ اس کے کانوں میں آواز زیادہ شدت سے گونجنے لگی —— مشین چلنے کی آواز —— یہ تو دن بھر ان کے کانوں میں گونجنے لگتی ہے۔ ہر روز اس کی زندگی کے آٹھ گھنٹے ہمیشہ اسی طرح مل میں اس کی گھڑ گھڑ سنتے گزر جاتے ہیں، کہیں ایسا نہ ہو کہ ایک روز وہ بھی نندو کی طرح مشین کی پیٹ میں آجائے اس کے بال بچے بھوکے مرجائیں۔

"میری روپا" —— وہ کتنی روئے گی، اسے ایسا معلوم ہوا جیسے وہ مرگیا ہے، اور اس کے گھر والے رو رہے ہیں —— روپا کی ماں —— ڈھاڑیں مار مار کے رو رہی ہے۔ اس کی آواز رامو کے کانوں میں زور زور سے آنے لگی۔

"ابے دیکھ کے چل" —— وہ چونک پڑا —— اور پھر ایک طرف کو ہوگیا۔ وہ سڑک کے بیچ و بیچ میں آگیا تھا ابھی یہ یکہ والا —— یہ بھی تو ہماری ہی طرح غریب آدمی ہے وہ ایسا محسوس کرنے لگا جیسا وہ اس کا بھائی ہے —— یہ سب مجدوری تو ہیں دن بھر مجدوری کرنے لگتے ہیں تو کہیں جاکر اپنا پیٹ پالتے ہیں پھر ایک ایک کے گھر میں کتنے آدمی ہوں گے اب اسی کو آخر پانچ چھ آدمیوں کا پیٹ پالنا پڑتا ہے اور دن بھر میں بارہ آنہ مجدوری ملتی ہے —— پر کیا کرے جس طرح بنتا ہے پورا کرنا ہی پڑتا ہے۔

"نندو" —— دوبارہ اس کا خون آلود جسم اس کی آنکھوں کے سامنے آگیا۔ اس کے گھر بار کا کیسا ہوگا۔ بیوی بچے سب ہی ہوں گے۔ کیا حال ہوا ہوگا

سن کر۔ بڑھیا ماں تو جندہ بھی نہ رہے گی وہ تو جبھی بے ہوس ہو ہو جا رہی تھی۔ بچاری کا ایک ہی لڑکا تھا۔ گھر کا چراغ تھا۔ اب اور کوئی ٹھکانا بھی تو نہ تھا۔ بس بھگوان ہی دیا کرے گا۔ اور یہ سیٹھ سالے تو رئیس بنے پھرتے ہیں۔ جن کے دل میں جرا بھی تو دیا نہیں۔ اس کی بڑھیا ماں کو کچھ دے دیتے تو کیا کمی آجاتی، پر بھگوان جتنا دھن دیتا ہے اتنی ہی لالچ بڑھتی ہے۔ ہم لوگ کام نہ کریں تو بچا کو پتا لگے بڑے اکڑے پھرتے ہیں۔ ہمارے بل بوتے پہ تو مل چلتی ہے۔ ہم لوگ نہ کام کریں تو پھر کون کرے گا ——— سالے چار روج میں ——— اس کی زبان پر بیساختہ گالی آگئی مگر وہ کچھ سوچ کر رک گیا اس وقت اس کے دماغ پر ایک خاص قسم کی سستی چڑھی ہوئی تھی، اس کا جی گھبراتا نہ ہوتا تو وہ نہ جانے کتنی گالیاں سنا چکا ہوتا۔

نندو کی ماں کی چیخیں اس کے کانوں میں گونج رہی تھی پر کتنا جالم ہے یہ سیٹھ بھی اس کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہ دیکھا، اس کی ماں کو گالیاں دیکر نکلوا دیا۔ اور نندو کی لاش کو اٹھوا کر سڑک پر ڈلوا دیا اسے ایک جھرجھری سی آئی ——— ہائے بھگوان اس نے کتنا بڑا پاپ کیا ہے۔ آدمی آدمی کو ایسا ستائے۔ اس پاپ کی اسے سجا جرور ملے گی ——— وہ چلتے چلتے رک گیا۔ آج کو نندو کی جان گئی۔ اور کل اس کی باری ہے۔ مجدور محنت کرنے آتے ہیں۔ اپنا اور اپنے بال بچوں کا پیٹ پالنے کے لئے وہ اپنی جان تھوڑا ہی دینے آتے ہیں۔ سیٹھ کا کیا ہے اس کی بلا سے۔ چاہے ہم سب مر جائیں۔ ہماری لاشوں کو بھی ایسے ہی اٹھا کر

سڑک پر پھنکوا دے گا، اور ہماری ماں بہنوں کو بھی ایسی ہی گالی دے گا۔
——— ہنہ ——— ہم غریب ہیں تو کیا ہماری عجت آبرو نہیں ہے۔ وہ
پھر آہستہ آہستہ چلنے لگا۔ اس کی آنکھوں سے خون اتر رہا تھا ——— سالے
کی آج لاش ڈال دیتے وہ سوچنے لگا ——— مزدوروں نے کتنی
بزدلی کا ثبوت دیا۔ آج سیٹھ کا سر پھوڑ دینا چاہئے تھا ——— نندو کی لاش
پڑی تھی اور مل میں کام ہو رہا تھا جیسے کچھ ہوا ہی نہیں، مجدور تھا تو کیا اس میں جان
نہیں تھی۔ اسکے پاس پیسہ ہی تو نہ تھا اور کس بات میں وہ سیٹھ سے کم تھا" یکایک سنجیدگی نے اسپر ایک ضرب لگائی۔
"سیٹھ سے جیادہ ہی کس بات میں تھا پر جیادہ ہو نہ ہو پر آدمی تو تھا ———
——— بار بار اس کی زبان پر گالی آتی تھی اور وہ دانت پیس کر رہ جاتا
اس کے قدم پھر رکے، وہ واپس جائے۔ مگر مزدور سب جا چکے ہوں گے۔
اب تو وہ گھر ہی جائے گا اور کل سب کو بتائے گا کہ نندو کا مرنا کوئی معمولی بات
نہیں، وہ سیٹھ کا خون پی لیں گے، اس نے سمجھا کیا ہے، گریب کی جان سیٹھ
کی جان سے کم نہیں، سیٹھ کے گھر تو سونا ہی سونا بھرا پڑا ہے، وہ مر جائے گا تو بھی
اس کے گھر والے مزے کریں گے اور نندو کی ماں ——— نندو کے گھر میں تو
ایک وقت کا آٹا بھی مشکل سے ہوگا۔ اس کی بیوی، بچے، ماں، سب ہی بھوکے
مر جائیں گے ——— وہ پھر گھر کی طرف چلنے لگا وہ مزدوروں
کو بتائے گا کہ تم کیا ہو ——— پچھلے دنوں جب ہم نے ہڑتال کی تھی تو

بھی سیٹھ کی نانی مرگئی تھی ۔ اس نے سمجھ کیا رکھا ہے نندو کی لاش اسے پھنکوادینا
کوئی ذراسی بات نہیں ہے ۔ گرمی کی تیز دھوپ میں وہ چلا جارہا تھا ۔ گرم ریت
اس کے پیروں کو جلائے دے رہی تھی ——— غصّہ سے اس کا خون
کھول رہا تھا وہ دانت پیس رہا تھا ، اب کوئی کام کرنے نہیں آئے گا ۔ ان
کی جان کوئی فالتو ہے جو ایسے مریں گے ، پھر کچھ حاصل نہ وصول ، دن بھر کام
کرتے ہیں اور مجدوری دہی بارہ آنے ——— کوئی زیادہ تو مل نہیں
جاتا ——— ہنک ——— ایک حقارت آمیز مسکراہٹ
اس کے ہونٹوں پہ ظاہر ہوئی ——— ناج بھی تو الگ مہنگا ہو رہا ہے
ناج کا خیال آتے ہی جیسے نندو کی ماں اس کے سامنے کھڑی ہو ۔ بھگوان جانے
اس پر کیا بیت رہی ہو گی ننھے ننھے بچے ——— بچوں کے رونے کی سی
آواز اس کے کانوں میں گونجنے لگی ، جیسے وہ بھوکے ہوں اور روتے ہوں
جب سے نندو مرا ہے انھیں کھانے کو نہیں ملا ۔ رامو کانپ اٹھا ———
بھگوان ان کی مدد کرے گا ۔ اس کے منہ سے نکلا ۔ اس دن اس کی ماں کیسی
بلک رہی تھی ۔ ایسا دکھائی دے رہا تھا ، جیسے دھرتی بھی کانپ رہی ہے ۔
کل سب کے آنے سے پہلے ہی وہ مل میں پہنچ جائے گا ۔ وہ مزدوروں
کو بتائے گا ۔ ان کے بدن میں آگ سی لگا دے گا ——— نندو ۔
——— نندو ——— انھیں کا بھائی بندو تو تھا ۔ اس کے

ساتھ سیٹھ نے ایسا سلوک کیا ——— ہوں ——— غصہ کے سے اس کے ماتھے پہ شکنیں پڑ گئیں۔ گرم گرم ریت میں اس کے پاؤں جلنے جا رہے تھے۔ گھر بھی تو تھوڑی دور رہ گیا ہے ——— بچے بھوکے ہوں گے پہ آج مزدوری بھی تو نہیں ملی ——— اس نے اپنی رفتار تیز کر دی۔

"کھاٹ بھی تو جھینگا ہو گئی" رامو کی ماں بیٹھے بیٹھے ٹوٹے ہوئے بان باندھنے لگی۔ بان ہی کہاں سے آئیں۔ جب کھانے کو نہیں ملتا۔ اتنے کہنے میں کیا بنتا ہے اور کل سے تو وہ بھی نہیں" وہ خود ہی بڑبڑا رہی تھی، کل دن میں روٹی پکی تھی۔ تگی روٹی سب نے کھا پی لی تھی اور اب تو صبح سے بچے رو رہے ہیں۔ بھوک بھوک کر کے بہو کو پریشان کر رہے ہیں۔ دادی پڑے پڑے بول ہی اٹھی۔ "کیوں بہو کو کھائے لو ہو ——— رامو آتا ہوگا۔ کچھ نہ کچھ تو لائے گا ہی۔ پر بچے وہ کہیں مانتے ہیں۔ گھر میں ہو یا نہ ہو ان کے لیے لانا ہی پڑے گا۔ اگر سمجھ ہوتی تو ہٹ کیوں کرتے۔

بڑھیا نے بیٹے بیٹے باہر کو جھانکا۔ رو پا دروازے پہ بیٹھی ہوئی کھیل رہی تھی، گیلی گیلی مٹی کے پیڑے بنا رہی تھی۔

"یہ بھیا کا ہے ——— یہ منے کا ——— اور یہ سب سے بڑا میرا ہے۔"

"کیا کر رہی ہے رد یا" دادی نے پوچھا

ردیا نے کنکھیوں سے مڑ کر دیکھا۔ "ہاں ایک دادی کا بھی تو ہے"

وہ جلدی جلدی ایک پیڑا اور بنانے لگی۔

"سنتی نہیں ردیا"! ـــــــــ دادی پھر چلائی۔

"آ رہی ہوں"ـــــــــ

"ہر وقت مٹی کوڑے میں پڑی رہتی ہے۔ چلاتے چلاتے تھک جاؤ۔

اور سنتی ہی نہیں"

دادی بڑبڑائے جا رہی تھی "اونہہ" ـــــــ بڑھیا نے دھوتی کا پلّو ہلایا۔ مکھیاں پٹے ہی جا رہی تھیں۔ جیسے برسات کے جھڑ میں لپٹی ہیں۔ اور وہ اڑاتے اڑاتے تھکی جا رہی تھی۔ کوئی پنکھا بھی تو پاس نہ تھا۔ پنکھے ہی کون سے دھرے ہیں۔ ایک ٹوٹا ہوا پڑا ہے اس کھرسا میں منگایا تھا۔ اب تو پیسہ کہاں جڑ سنگائے۔ پر بغیر پنکھے کے بھی گجر نہیں ـــــــ گرمی ہے کہ کھائے لے رہی ہے۔ اے بھگوان! ـــــــ وہ گھبرا گھبرا کر کروٹیں لے رہی تھی۔

"اری ردیا؟ ـــــــ بڑھیا نے پھر آواز دی" مجھے پنکھا اٹھا دیجیو مکھیاں کھائے رہی ہیں تجھے تو ہر وقت کھیل ہی لگا رہتا ہے کسی کام کی نہیں یہ لونڈیا۔ پرائے گھر جانا ہے تجھے بچی کوئی سدا یہیں تھوڑی ہی بیٹھی

رہے گی"۔ دادی معلوم نہیں کیا کیا کہہ رہی تھی۔ مگر اس نے کھیل کی دھن میں کچھ بھی نہ سنا اور سنا بھی تو ان سنی کر دی۔ اور دوڑ کے پنکھا اٹھا لائی

"تیری ماں کہاں جا کے بیٹھ گئی"

"پانی بھرنے گئی ہے ——— وہ پھر بھاگتی ہوئی گئی اور جا کے اپنے کھیل میں لگ گئی"۔

"اونہہ ——— اونہہ ———" بڑھیا کراہ رہی تھی "دن چھپ گیا رامو ابھی تک نہیں آیا۔ جانے کیا بات ہوئی ——— آتا ہی ہوگا اس نے اپنے آپ کو تسلی دی۔" آٹا لینے چلا گیا ہوگا وہ بھی توکل کا بھوکا ہے۔ سویرے سے کام پر گیا ہوا ہے ——— ہائے لال میں نے تجھے اس دن کے لیے پالا تھا کہ تو فاقے کر کے دن کاٹے۔ میں نے تیری کیسی کیسی ہٹیں پوری کی تھیں یہ اس کی خبر نہ تھی کہ کرم میں کیا لکھا ہے ——— اونہہ ——— اونہہ ——— کھاٹ میں کھٹمل ہو گئے ہیں۔ دیکھیں بڑھیا نے چارپائی پہ دو ایک ہاتھ مارے اور پھر جھک کر نیچے دیکھا۔ کوئی گرا تو نہ تھا پر کاٹ کیا چیز رہی ہے جیسے کوئی سوئی چبھتی ہے اس نے پھر جھاڑا ———

"کون! ——— بہو آ گئی ردیا؟"

"کیا ہے ماں؟" ——— بہو بولی۔ "پانی بھرنے گئی تھی۔ وہ آٹا لاتے ہوں گے پھر رات کو پانی کیسے بھرتی۔

"اچھا کیا ——— ایک کٹورے میں مجھے بھی پانی دیدے ——— ٹھنڈا ہے ؟"

"ہاں" ——— رانی کٹورے میں پانی لے آئی ۔

"ہائے بھگوان ! ——— کس چاؤ سے میں نے رامو کا بیاہ کیا تھا کیسی سندر بہو تھی ۔ سندر تو اب بھی ہے پر رزق کی مار نے اس کا رنگ روپ سب لے لیا جب پیٹ کو روٹی ہی نہیں ملتی تو تندرستی کہاں ——— رامو کا جسم بھی کیسا بھرا بھرا تھا پر اب کیا رکھا ہے ہڈیوں کا پنجر ہو گیا ہے ۔ ناک پکڑے دم نکلتا ہے دودھ دودن کھانے کو نہیں ملتا تو کہاں سے تندرستی ہوگی ، ہمارا نرمل ہی جب پیدا ہوا تھا تو کیسا موٹا تازہ تھا ، اور اب تو جیسے کوئی سوکھے کا بیمار ہو ، بدن پہ بوٹی ہی نہیں ، بھوک بھی کیسی بری بلا ہے وہ سوچنے لگی ——— صبح سے بھو کو پیٹ رہے ہیں ۔ بچے ہیں وہ کیا جانیں کہ یہ کہاں سے روٹی دیدے گی جب ہے ہی نہیں ۔

"ماتا جی یہ نرمل نہیں مانتا ، روٹی روٹی کر رہا ہے اور ان کے بابو جی ابھی تک نہیں آئے ۔"

بڑھیا سوچ میں پڑ گئی ——— بھگوان تو نے یہ بچے دئے تھے تو ان کے پیٹ کو بھی دیا ہوتا ۔" اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے ۔ کیا سارے سنسار کا دکھ ہمارے ہی باٹے میں آ گیا ——— ہمارا اکھ چین بھی

تو نے امیروں کو ہی سونپ دیا ——— ہائے رام ———

——— پانی بھر کے ہانڈی چولہے پر دھر دے ——— رامو بھی آتا ہی

ہوگا۔ اتنے بالک بہل جائیں گے۔"

بھگوان کوئی دن ایسا بھی آوے گا جب ان بچوں کو پیٹ بھر روٹی ملے گی۔

بہو کی آنکھیں ڈبڈبا آئیں ——— اور اس نے پانی بھر کر ہانڈی چولہے

پر رکھ دی ——— نیچے آگ جلادی اور وہیں سر جھکا کر بیٹھ گئی کوئی کام بھی

تو نہ تھا جس میں اس کا جی لگتا اور کام ہی کیا ہوتا۔ کھانے پکانے میں دن کٹ جاتا تھا

سب سے زیادہ تو پیٹ ہی کا دھندا ہوتا ہے اور جب کل سے گھر میں دانا نہیں ہے تو

کس کام میں لگتی ——— ہاں صبح سے بچوں کو بہلاتے بہلاتے یہ وقت آگیا

کسی کو گود میں اٹھایا۔ کسی کو گھٹنے پر بٹھایا پر بھوکے بچے کہیں بہلتے ہیں۔ صبح سے

نرل نے روتے روتے آنکھیں سجا لیں۔

"ماتا جی روٹی" ——— نرل پھر رو دیا۔"میں تو روٹی کھاؤں گا۔"

"پکا تو رہی ہوں بھیا" ——— رانی نے دبی زبان سے کہا۔ وہ

بچہ سے جھوٹ بول رہی تھی پر کس طرح بہلاتی ——— وہ تو معلوم نہیں

کہاں جا کے بیٹھ گئے۔

"بہو رامو آگیا؟" ——— بڑھیا نے پڑے پڑے پوچھا

"ابھی کہاں آئے ہیں ——— ہاں آتے ہی ہوں گے کچھ خریدنے

چلے گئے ہوں گے۔"

"آہا جی میرے لئے خربوزہ لائیں گے" نرمل خوش ہو کر بولا

"اور میرے لئے بھی تو" ـــــــ مُنّا بھی اچھل پڑا

"اور بابو جی میرے لئے لال کرتا لائیں گے" ـــــــ روپا اترا کر بولی۔ "آہا جی، ہولی کو میں لال کرتا پہنوں گی ـــــــ آج تو ضرور ہی لا دیں گے۔"

ماں بیٹھی بیٹھی دیکھ رہی تھی۔ کتنے ناسمجھ ہوتے ہیں بچے۔ انھیں اپنے کھانے ہی کی فکر لگی رہتی ہے، یہ کیا جانیں کہ ماں باپ پر کیا بیت رہی ہے، یہی دن تو ہیں جب آدمی دُکھ سُکھ سے بے فکر ہوتا ہے، سنسار کا کوئی دکھ ان کے لئے دکھ نہیں ہوتا۔ وہ خیالات کے سمندر میں غوطے کھا رہی تھی۔

"ماتا جی! ـــــــ بابو جی تو آبھی گئے"۔ یہ روپا چلائی اور سب بچے دوڑ پڑے۔

"رامو آ گیا کیا"؟ بڑھیا نے ٹوٹی کھاٹ پر بیٹھے بیٹھے پوچھا

"ہاں آگئے" ـــــــ بہو نے جواب دیا اور پھر چپ ہو گئی

"میرے لئے خربوزہ لائے ہو بابو جی؟"

"اور میرے لئے لال کرتا بھی تو لائے ہوں گے"۔ روپا رامو کے گلے میں لپٹ گئی۔ "کیوں بابو جی؟" اس نے پھر پوچھا۔ رامو خاموش تھا

ودھو بھی ایک ٹھنڈی سانس لیکر خاموش ہو گئی۔

چھن چھن ——— جیسے انگاروں پہ پانی کے قطرے ٹپک رہے ہوں۔ شاید بہو رو رہی تھی۔

مزدوروں نے ہڑتال کر دی تین دن سے مل بند ہے سوچتے سوچتے بھگوان داس کا دماغ جیسے خراب ہو گیا ہو۔ وہ سوچنا چاہتا تھا، مگر سوچ نہ سکتا تھا۔ وہ اٹھ کر کمرے میں ٹہلنے لگا، مگر کیا وہ اس طرح سب کو بھول جائیگا ——— پھر ایک نہیں اس کی چار ملوں میں ہر یک وقت ہڑتال ہوئی۔ ——— ہڑتال تو اس سے پہلے بھی کئی دفعہ ہو چکی تھی، مگر اس وقت اس نے مزدوروں کو بہلا پھسلا کر راضی کر لیا تھا اور اس وقت مزدور اتنا سمجھدار تو نہ تھے ان کو تو بس مزدوری ملتی تھی اور اس سے زیادہ کچھ سوچتے ہی نہ تھے۔ مگر اب تو کوئی صورت ہی نہیں دکھائی دیتی ——— مزدوری بڑھادی جائے ——— مگر کہاں تک مزدوری بڑھائی جائے گی یہ روز روز کا جھگڑا ہے ——— پھر کیا ہوگا آخر کب تک ملیں بند پڑی رہیں گی۔ ہزاروں روپیہ کا نقصان ہوگا۔ وہ دونوں ہاتھوں سے اپنا سر پیٹ لیتا ہے۔

"بھگوان میری مدد کر" ——— اس کی زبان سے نکلا ———

یہ مزدور بھی کتنے خود غرض ہوتے ہیں انھیں تو ہڑتال کرنے کا بہانہ ملنا چاہیے
—— مزدور مشین میں دب کے مر گیا تو میں کیا کروں ۔
—— کوئی میں نے مار ڈالا —— بھگوان کی مرضی تھی،
اس کی مرضی کے بغیر پتّا بھی نہیں ہل سکتا اور یہ مزدور —— مزدور
کتنے چالاک ہوتے ہیں ۔ وہ مرا اور مزدوری یہ بڑھوا رہے ہیں ——
ہونھ —— مزدوری تو اب ایک پیسہ بھی نہیں بڑھائی جائے گی ۔
سالے بدماش —— وہ تیزی سے کمرہ میں ٹہلنے لگا ۔

اس کے کانوں میں عورتوں کے گانے کی آواز سنائی دی —— وہ
سوچتے سوچتے چونک پڑا ۔ "گانا —— یہ گانا کیا ہے —— ؟"
عورتیں گا رہی ہیں —— گھر ہی میں سے آواز آرہی تھی اس نے سوچا
دیدی کو بلا کر پوچھوں گا ۔ یہ گانا کیوں ؟ —— میں پاگل ہو رہا ہوں
اور گھر میں خوشیاں —— غصّہ سے وہ کانپ اٹھا ——
روپیہ —— روپیہ —— اب کیا ہوگا —— مزدور
کام نہیں کریں گے، ملیں بند رہیں گی —— ایسا معلوم ہو رہا تھا
جیسے اس کا دماغ جواب دے چکا ہو ۔ اب وہ کچھ سوچ نہیں سکتا ——
"بھگوان میں کیا کروں ۔" اس نے پردہ ہٹا کر باہر کو دیکھا ۔ دیدی آرہی
ہیں، مگر وہ اتنی خوش کیوں ہیں، آج تو میری طرح سب کو پاگل ہو جانا چاہیے تھا،

لال کرتا

" داس! ـــــــ دیدی نے پردا اٹھا کر دیکھا۔ اور پھر کمرہ میں آ گئی"۔

" میں تمھیں بڑی اچھی خبر سنانے آئی ہوں۔ بولو، کیا دو گے، بس تم خوش ہی تو ہو جاؤ گے"۔

" بھگوان داس کا چہرہ چمک اٹھا " کیا ملیں کھل گئیں ـــــــ دیدی ؟"

" ملیں! ـــــــ کیسی ملیں ـــــــ پاگل ہو گیا ہے"۔ دیدی کے ماتھے پر شکنیں پڑ گئیں۔ " جب بھی تیرے پاس آؤ۔ مل، مزدور، بس یہی تو لگا رہتا ہے! میں پوچھتی ہوں تجھے کیا ہو گیا ہے"۔ دیدی برس ہی تو پڑیں ـــــــ اور داس چپ چاپ کھڑا منہ تک رہا تھا جیسے کوئی دیوانہ ہے، جسے اپنے تن بدن کا بھی ہوش نہ ہو، بال الجھے ہوئے معلوم نہیں کتنے دن سے ان میں کنگھی نہیں ہوئی اور یہ حالت دیکھ کر دیدی کے تو جیسے تن بدن میں آگ ہی لگ گئی ہو۔ اسے تو ہر وقت وہی روپیہ کی فکر ـــــــ جب دیکھو یہی روگ۔ بھگوان اسے عقل دے۔ دھن دولت سے گھر اٹا پڑا ہے۔ پھر بھی ہر گھڑی وہی دھن۔ ـــــــ کس کام کا وہ روپیہ جو کام نہ آئے۔ سونے سے الماریاں بھری پڑی ہیں پھر بھی چین نہیں۔ کس بلا کی بھگوان نے ہوس دی ہے ـــــــ اتنا دھن بھی اچھا نہیں، جو آدمی کو کہیں کا نہ رکھے۔ نہ بھگوان کا ڈر، نہ دنیا کی لاج ـــــــ

دیدی کو کچھ ایسی چڑ ہو گئی تھی کہ وہ روپیہ کے نام سے جل ہی جاتیں۔ وہ داس سے انھیں باتوں پہ ہمیشہ ناراض رہتی تھیں۔ ہفتوں وہ گھر میں نہیں آکے گھسنا تھا۔ اب تو خیر اس کے بیاہ کو تیسرا برس ہے، جب نئی نئی بیاہی ہوئی بہو آئی تھی جب بھی کون سی خبر لیتے تھے۔ بیاہ سے آج تک بھی ایک آن اس نے سکھ سے نہیں گزارا۔ آخر ایسی بھی کیا ہوس جو دن رات بڑھتی ہی چلی جائے۔ پوجا پاٹ سب ہی تو ختم ہو گئے۔ ایک پیسہ برہمن کے نام کا نہیں نکلتا، پنڈت بھی دوارے آتا ہے تو خالی ہی جاتا ہے۔ آٹے کی ایک چٹکی تو اسے کھلتی ہے۔ دیدی اندر ہی اندر جل رہی تھی اور معلوم نہیں غصہ میں اسے کب کب کی باتیں یاد آرہی تھیں۔ اس کا جی چاہ رہا تھا کہ آج داس کی خوب خبر لے۔ مگر اس کی دہشت ناک صورت دیکھ کر وہ چپ ہی ہو رہی یوں تو وہ اس کی بڑی بہن تھی اور ذرا سی بات پہ اس کو سو سو سناتی تھی۔ بھلا وہ اس سے ڈرنے والی تھی۔ مگر اس نے سوچا۔ اسے تو بھوت سوار ہے کون چھیڑے ـــــ وہ واپس جانے لگی۔

"دیدی!" ــــــــ داس نے پکارا، مگر اس نے جواب نہ دیا داس نے آگے بڑھ کر اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔

"تمھیں غصہ آگیا دیدی؟ ــــــــــــ اچھا سناؤ کیا سنانے آئی تھیں۔"

"میں کچھ نہیں سنانا چاہتی۔ ہٹ میرا ہات چھوڑ دے۔ میں ایسے دیوانے سے

بات نہیں کرتی"۔ اس نے داس کا ہات جھٹک دیا۔

گھر میں سے گانے کی آواز برابر آ رہی تھی، ڈھولک نج رہی تھی، سہاگ گائے جا رہے تھے، عورتیں، لڑکیاں سب ہی مل کر گا رہی تھیں۔ "بھگوان نے کیسی سندر لکی دی ہے"۔۔۔۔۔ عورتیں کہہ رہی تھیں مگر وہ کوئی بات بھی سمجھ نہ سکا اس کے دماغ میں تو روپیہ ہی روپیہ گھوم رہا تھا۔

"دیدی گوند تو بناؤ"۔۔۔۔۔ داس کی چھوٹی بہن نے پکارا۔"

"گوند۔۔۔۔۔ کیسا گوند؟۔۔۔۔۔ داس نے پوچھا

اور ہاں دیدی یہ گیت کیوں گائے جا رہے ہیں؟"۔۔۔۔۔ مگر دیدی نے کوئی جواب نہ دیا، اور بڑبڑاتی ہوئی باہر چلی گئی۔ داس نے اپنے جسم کو صوفہ پر گرا دیا۔ "بھگوان جانے دیدی کیا کہنے آئی تھیں۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ آمدنی کا کوئی ذریعہ ان کو معلوم ہوا ہو، اور وہ مجھے بتانے آئی تھیں، شاید یہی بات ہو، مگر وہ میری باتوں سے ناراض ہو کر چلی گئیں۔ شاید انھوں نے مجھے پریشان کرنے کی وجہ سے نہیں بتایا۔ بڑی چالاک ہیں دیدی۔ ہو نہ ہو۔۔۔۔۔ یہی بات ہے۔ اسے یقین ہو چلا تھا کہ ضرور کوئی ایسی ہی بات ہے، ممکن ہے کہ مل کھلا ہو، مگر مجھے نہ معلوم ہوتا آخر انہیں کس نے بتایا۔ مل کی عمارت اس کی آنکھوں کے سامنے آ گئی۔ مشینوں کی گھڑگھڑاہٹ اس کے کانوں میں گونجنے لگی مشینیں چل رہی ہیں، مزدور کام کر رہے ہیں۔۔۔۔۔ کھن کھن کھن۔۔۔۔۔

اس کے سامنے روپیوں کا ڈھیر ہو رہا تھا۔ ایک دن کا منافع ـــــــ خاصا تو ہے اب مدد نزد یہی طرح بڑھتے گا۔ اب کبھی مل نہیں بند ہوگی، مزدور ہڑتال نہیں کریں گے، ان کو اور کیا چاہیے بارہ آنہ روز مزدوری ملتی ہے بس بہت ہے ـــــــ اس سے آگے پیسہ نہیں بڑھایا جائے گا، روپیہ روپیہ ـــــــ پھر اس کے منہ سے نکلا ـــــــ کھن کھن ـــــــ جیسے اس کے دماغ میں روپیہ بج رہے ہوں۔

پندرہ دن ہو گئے پربھو کا بخار اترنے کا نام نہیں لیتا۔ دو چار پیسہ کی دوا بھی پلائی۔ آج صبح سے کچھ کم تھا اس وقت پھر سارا بدن آگ کی طرح تپنے لگا رامو کی ماں سارے سارے دن اسی کی پٹی سے لگی بیٹھی رہتی تھی۔ روپا بھی اپنے ننھے ننھے ہاتوں سے پنکھا ہلاتی رہتی تھی۔ ترمل اور منا تو دادی کو دن بھر پریشان کرتے۔ منا تو کسی وقت بھی گود سے نیچے نہیں اترتا تھا۔ دادی بہتیرا بہلاتی تھی پر وہ کہاں ماننے والے تھے بچے تو بس ماں ہی کے قابو کے ہوتے ہیں۔

"پانی" ـــــــ بہو نے آہستہ کہا اور پھر آنکھیں بند کرلیں۔

ـــــــ ساس نے اپنے پیر کا سہارا دیا اور بٹھا کر کٹورا منہ سے لگا دیا۔ خالی پیٹ سارے دن پانی پیتی ہے۔ آٹھ دن سے تو کھیل اڑ کر بھی منہ میں نہیں گئی ـــــــ ہائے بھگوان یہ کیسے بچے گی۔ ساس کے

منہ سے نکلا کوئی دوا دارو بھی تو نہیں۔ جو ذرا بہت پیٹ میں جائے۔ دوا بھی کہاں سے ہو جب پیسہ ہی پاس نہیں۔ چار پیسہ دودھ کے لئے تو ہیں نہیں ——— پھر بغیر کھائے پیئے اس میں جان کہاں سے آئے گی ——— کتنا پانی پیتی ہے۔ بخار میں پیاس لگتی ہے۔ ساس نے بہو کے ہونٹوں پر انگلی پھیری۔ کیسے خشک رہتے ہیں ہونٹ۔" رودپا آہستہ آہستہ پیر دبا رہی تھی۔ وہ سارے دن اپنی ماں کے کام میں لگی رہتی۔ کبھی سر دباتی اور کبھی پیر اور کبھی پنکھا کرتی۔ جانے بھگوان اسی کی سن لے۔ اور اس کی ماں اچھی ہو جائے۔ غریب کے پاس دعا ہی ہوتی ہے اور کیا دھرا ہے۔

"اونہ ——— اونہ" ——— بہو کراہ رہی تھی

اور ساس ہات اٹھا اٹھا کر دعائیں مانگ رہی تھی۔

"وہ گئے؟" بہو نے آہستہ سے پوچھا۔ اور پھر آنکھیں بند کر لیں"۔

"ابھی تو نہیں آیا ——— آتا ہی ہوگا ——— ساس بولی اور پھر آہستہ آہستہ اس کا سر دبانے لگی۔ معلوم نہیں رامو کہاں جا کے بیٹھ گیا کس وقت کا گیا ہوا ہے، کوئی دو گھنٹہ تو ہو گیا ہوگا۔ کہہ دیا تھا کہ دیر مت کریو بہو کا بخار بڑھ رہا ہے۔ پر اسے کیا پرواہ کوئی مرا کرے۔ ایسا بھی کیا بے فکرا آدمی جسے بیمار کی بھی فکر نہ ہو۔ کوئی لانے والا ہوتا تو اب تک تو دس بار دوا آجاتی۔" رامو کی ماں بڑبڑا رہی تھی۔ جوں جوں دیر ہو رہی تھی اس کا غصہ

بڑھتا جارہا تھا وہ جا سکتی تو کبھی بھی کسی کو دوا کے لئے نہ بھیجتی۔ آئے آج رامو۔ کیسا جھاڑتی ہوں رامو کو۔"

"پانی" اس نے ہونٹوں پر زبان پھیری" اس کو کتنی پیاس لگ رہی تھی۔

"زیادہ پانی مت پیو رامو دوا لاتا ہوگا" ساس کی آنکھیں دروازے کو لگی ہوئی تھیں۔ رامو آتو رہا ہوگا۔ راستہ ہی ہوگا۔ وہ سوچنے لگی ——

جہاں کوئی کھٹکا سنائی دیتا۔ وہ چونک پڑتی۔

"رامو آگیا" ——— دن چھپتا جارہا تھا۔ رامو آجاتا تو جلدی دوا پلا دیتی۔ پتا نہیں رات کیسے کٹے گی۔ ساری رات جاگتے گزری۔ ایسا بخار بھی جو کسی وقت جاگنے کا نام نہیں لیتا، اور درد سے ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے آگ جل رہی ہے، انگاروں کی سی گرمی ——— بھگوان دیا کرے۔

"بابو جی آگئے؟" — ردیا بولی۔

"کہاں جا کے بیٹھ گیا تھا رامو" ——— یہ بھی نہ سوچا کہ گھر میں بیمار پڑی ہے"۔ ماں رامو کو دیکھتے ہی چلائی۔ مگر جب رامو کے ہاتھ میں دوا کی شیشی دیکھی تو کچھ ٹھنڈی ہوئی۔

"دو دو گھونٹ اک دوا ہے ———" رامو نے شیشی ماں کے ہاتھ میں دیدی۔ "کمپوڈر تو بڑا بدماش ہے سالا۔ پھر ڈاکٹر صاحب کے پاس گیا

تو انھوں نے کہا مریض کو بغیر دیکھے ہم دوا نہیں دیں گے ۔ تب میں نے بڑی منت سماجت کی کہ سرکار ہم غریب آدمی ہیں ان کے پاس ایک بابو بیٹھے تھے انھوں نے بھی کہا کہ بھئی لکھ دو نسکھا ـــــــــــ تب کمپوڈر نے دوا دی ۔"

"پر ڈاکٹر نے دودھ پینے کو بتایا ہے ۔" رامو بولا ـــــــــــ "دو کھوراک دوا ہی بڑی مسکل سے ملی ہے اب دودھ کہاں سے آئے گا ۔ وہ سوچنے لگا ۔ "بھگوان نے اتنا پیسہ بھی نہ دیا کہ اس کی دوا بھی کر سکوں ۔ آج کتنے دنوں سے اس نے کچھ بھی نہیں کھایا ۔ دو ایک پیسہ کا دودھ بھی اس کے پیٹ میں جانا ضروری ہے ۔ نہیں تو کھاٹ سے کیسے اٹھے گی ۔ پر پیسہ کہاں سے لاؤں ۔

روپا جلدی سے کٹورا اٹھا لائی ۔ رامو نے دوا الٹی اور بہو کو ماں نے سہارا دیکر بٹھا لیا "روپا! ـــــــــــ پانی بھی لے آ" ـــــــــــ دادی بولی ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اور پھر دوا پلا کے آرام سے لٹا دیا ۔ بہو کی آنکھیں کھل گئیں وہ اپنے پتی کو دیکھ رہی تھی ۔ "میں یہی دوا پھر لاؤں گا ، روپا کی ماں تو گھبرانا مت کل تک اچھی ہو جائے گی "۔

ماں نے اپنے کان سے بالی نکال کر رامو کے ہات میں دیدی ۔ "جا دودھ لے آ ۔ پیسہ تو میرے پاس ہیں نہیں ۔ وہ سوچنے لگی یہ اچھی ہو جائے گی تو سب کچھ ہے ۔ ننھے ننھے بچّوں کے بھاگ سے ہی بچ جائے ، اسی کے دم سے

گھر میں چراغ جلتا ہے، ہمارا کیا آج مرے کل دوسرا دن، بچنے کے دن تو انھیں کے ہیں۔ سوائے دکھوں کے انھوں نے ابھی دیکھا ہی کیا ہے۔ بھگوان ان کی مرادوں کو پورا کرے گا۔

"گلاس لا روپا ——— دودھ لے آؤں ——— روپا دوڑ کر گلاس اٹھا لائی۔ رامو نے روپا کو پیار کر کے گود میں اٹھا لیا، اپنی ماتا کا خوب کام کیا کر۔ بڑی اچھی لگتی ہے تجھے اچھی اچھی چیزیں لا کے دوں گا

"جب ماتا جی اچھی ہو جائیں گی؟"

"ہاں" رامو نے پیار کر کے کہا

"اور لال کرتا بھی لا دینا بابو جی ——— چمپا کا لال کرتا بڑا اچھا لگتا ہے۔ اس نے ہولی کے لئے بنوایا ہے۔ روپا نے باپ کے گلے میں باہیں ڈال دیں۔ بابا جی، میں ہولی کے دن لال کرتا پہنوں گی؟"

وہ اس کے لئے لال کرتا ضرور لائیگا۔ کتنے دن سے کہہ رہی ہے میری روپا ——— وہ اسے گود سے اتار کر دودھ لینے چلا گیا ——— دن چھپ گیا تھا۔ کبھی دیر ہو جائے اور دودھ نہ ملے۔ اس کے قدم تیزی سے اٹھ رہے تھے۔

بھگوان داس کہ رہے تھے بال پریشان، آنکھوں میں جیسے آگ

آگ بھری ہو۔ رانی اس کے سامنے کھڑی تھی بچی کو دونوں ہاتھوں میں لئے ــــــ اس کی آنکھوں میں التجا تھی، حسرت تھی، یاس تھی، ــــــ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے وہ سراپا فریاد ہے۔ بھگوان داس اس کو قہر آلود نگاہوں سے دیکھ رہا تھا اور وہ کانپ رہی تھی جیسے آندھی سے سوکھی ہوئی ڈال لرز رہی ہو۔ وہ بھی تو ایک ڈال ہی تھی، جو کبھی کی سوکھ چکی تھی، مگر آندھی کے جھونکے کہیں اس کو بھی گرا نہ دیں۔ سوکھی ہوئی ڈال کا بھروسہ ہی کیا معلوم نہیں کس وقت نیچے آ رہے۔

"میں کیا کہہ رہا ہوں! ــــــ اس کو لے کر میرے سامنے سے چلی جاؤ" ــــــ داس گرج کر بولا۔

رانی کی آنکھوں میں آنسو تھے؛ وہ سر جھکائے خاموش کھڑی تھی۔ کیا اتنا ظالم باپ بھی کسی کا ہو سکتا ہے۔ اپنی ننھی سی بچی سے نفرت ــــــ لے بھگوان آسمان پھٹ پڑے گا ــــــ لڑکی لڑکا تو پرمیشر کی دین ہے کوئی اپنے بس کی بات ہے۔ وہ واپس چلی جاتی مگر اس کی صرف ایک تمنا تھی کہ اس کا پتی ایک نظر اپنی بچی کو دیکھ لے۔ اس کو پیار کرے اور میں ــــــ مل میں ہڑتال ــــــ یہ کوئی نئی بات ہے ــــــ ہوتی ہی رہتی ہے اور مزدوروں کے پیٹ کو روٹی نہ ملے گی تو کیا کریں۔ وکیلات ان کے بس کی ہے ــــــ اتنا دھن ہے کیا چار پیسے مزدوری نہیں بڑھائی جا سکتی۔

"میری آنکھوں کے سامنے سے دور ہو جاؤ ——— میں پاگل ہو رہا ہوں ورنہ اس کے اور تمہارے گولی مار دوں گا۔"

والی سوچتے سوچتے چونک پڑی اس کے کانوں کو یقین نہ آتا تھا۔ یہ ایک باپ اپنی اولاد کو کہہ رہا تھا۔ اس نے بچی کو کلیجہ سے لگایا "میری بچی!" اس کی آنکھیں ڈبڈبا آئیں۔ "تو کیا پھٹا کرم لے کر آئی تھی۔ بھگوان تو اسے ———" وہ آگے کہہ نہ سکی ہائے وہ اپنی بچی کو کوس رہی ہے۔ یہ تو اس کے جیون کا سکھ چین ہے۔

ہائے تیرا باپ کتنا بے رحم ہے پر تیری ماں اپنی ساری ممتا تجھ پر ختم کر دے گی ——— میری ننھی ——— تو دکھی نہیں رہیگی

"پتی دیو!" ——— اس کی زبان سے نکلا "کیا ایک نظر بھی تم اسے دیکھ نہیں سکتے۔ تم اس کو پیار نہیں کر سکتے" ———

داس پاگلوں کی طرح ہنس رہا تھا۔ اس کی آنکھیں دہشت ناک ہو گئی تھیں۔

"تو تم نہیں جاؤ گی؟ ——— میں تم سے پھر کہتا ہوں کہ تم اس منحوس لڑکی کو یہاں سے لے جاؤ۔"

وہ اٹھ کر کمرے میں ٹہلنے لگا والی سہم گئی۔ کہیں وہ اس کی بچی کو چھین کر پھینک نہ دے۔

"میں جا رہی ہوں ———— میں جا رہی ہوں" ———— وہ بولی اور اسے
ایسا معلوم ہوا کہ جیسے اس کی بچّی کو داس نے دیوار سے دے مارا ہو۔ خون میں لتھڑی
ہوئی ننھی سی لاش اس کے آنکھوں کے سامنے پھر گئی۔ اس نے بچی کو دونوں ہاتھوں
سے سینے سے چمٹا لیا اور جھپٹ کر کمرے سے نکل گئی۔

بھگوان داس نے اپنے جسم کو پھر کوچ پر گرا دیا ———— "بھگوان دیا کر"
اس کی زبان سے نکلا۔ "میری عقل جواب دے چکی ہے۔ میں پاگل ہو گیا ہوں۔"
اب کیا ہوگا، ملیں بند ہیں۔ اس کا دماغ بیکار ہو گیا تھا اور اب وہ کچھ سوچنا نہیں
چاہتا تھا۔ اس نے اپنی گردن کو زور سے جھٹکا دیا۔ مگر نہیں وہ کیسے بھول سکتا ہے
یہ باتیں بھلا بھول جانے کی ہیں۔ ہنک ———— اس سے کتنی بڑی بھول
ہوئی وہ غصہ میں سوچ نہ سکا کہ مزدوروں کو کس طرح بہلایا جا سکتا ہے اس نے
ان کو مارا، مزدور کی لاش کو اٹھوا کر سڑک پر ڈال دیا اور اس کی ماں کو نوکروں
سے کہہ کر مل کے باہر نکلوا دیا ———— ہائے بھگوان میں نے کتنا بڑا پاپ
کیا" اس نے اپنے ماتھے پر زور سے ہاتھ مارا ———— وہ روپیہ
خرچ کر کے مزدوروں کو بہلا سکتا تھا۔ اس طرح مزدور بڑی آسانی سے قابو
میں آ سکتے تھے۔ اس نے کتنی بڑی غلطی کی جس کی اب تلافی ناممکن ہے وہ سوچتے
سوچتے گھبرا گیا۔ الماری میں سونے کی اینٹیں پڑی رہی تھیں۔ "اے بھگوان
کیا ان میں جان پڑ گئی" اس کے منہ سے یکبارگی نکلا۔ خوف سے اس کا جسم کانپنے

لگا ——— آنکھیں پھٹنے لگیں ——— یہ ——— یہ ——— لاشیں ——— مزدوروں کی لاشیں ۔ اس کی آنکھوں کے سامنے چکر سا آیا۔ پورا کمرہ گھومتا دکھائی دیا۔ گھڑ گھڑ گھڑ ——— مشین چل رہی تھی۔

"نندو ——— مشین میں ——— وو ڑ و" ——— مزدوروں کی آوازیں اس کے کانوں میں گونجیں ——— نندو کی لاش اس کے سامنے پڑی تھی، خون میں لتھڑی ہوئی ——— لاش ——— لاش وہ چلایا ——— پر اس میں تو جان ہے وہ ہلتی دکھائی دے رہی تھی، جیسے کروٹ لے رہی ہو۔ وہ اس کا جسم تھر تھر کانپنے لگا۔ یہ یہاں کیوں آئی ہے مجھ سے بدلہ لینے۔ وہ سوچنے لگا "بھگوان مجھے بچا" ——— ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے نندو کی لاش اٹھ رہی ہے۔ اب وہ اس کی طرف بڑھے گی اسکی پھٹی پھٹی بے نور آنکھیں اسے گھور رہی تھیں ——— باہر کو نکلے ہوئے سفید سفید دانت، اسے چبا ڈالیں گے، خون کا قطرہ قطرہ چوس لیں گے۔

"اف ——— بھگوان! ——— یہ تو کھڑا ہو گیا ——— یہ چل رہا ہے ——— میری طرف آرہا ہے اب کوئی مجھے اس سے بچا نہیں سکتا۔ اس کے ساتھ بھگوان ہے اور میں اکیلا۔ وہ اس آہستہ آہستہ خوف سے پیچھے ہٹ رہا تھا۔ تجھ کو روپیہ چاہئے۔ لیجا مجھے کچھ نہیں چاہئے۔ مجھے اس جن سے

نفرت ہے یہ مجھے کھانے کو دوڑ رہا ہے ۔ بھگوان کے لئے میرے قریب نہ آ"۔۔۔۔ ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے وہ کہہ رہا تھا :" مجھے تیرا دھن نہیں چاہئے ۔ میں تجھ سے بدلہ لینے آیا ہوں ۔ مزدوروں کے خون کا بدلہ ۔۔۔۔۔۔۔۔ تو نے ہزاروں مزدوروں کا خون چوسا ہے ۔ یہاں کی ہر چیز مزدور کے گوشت اور خون سے بنی ہے ۔ یہاں کی اینٹ اینٹ تیرے ظلم کی گواہی دے رہی ہے ۔

"لیکن میرا روپیہ "۔۔۔۔۔۔۔ داس بولا

لاش کے ہونٹ ہلے ۔ "تیرا روپیہ ۔ مزدور کے گوشت کے برابر نہیں مزدور محنت کرتا ہے لیکن اس کو کچھ نہیں ملتا ۔ تو صرف پیسہ لگاتا ہے اور سب کا مالک ہے، تیرے گھر کے اندر سونا اگتا ہے اور مزدور بھوکا مرتا ہے ۔ وہ جاڑوں کی راتیں آگ کے سامنے بیٹھ کر گزار دیتا ہے ، تیری آنکھیں ہیں لیکن تو دیکھ نہیں سکتا ۔ تیرے کان ہیں لیکن تو سن نہیں سکتا "

"میں پاپی ہوں ۔۔۔۔۔۔۔۔ میں پاپی نہیں ہوں ۔۔۔۔۔۔" وہ چلایا

میں نے کتنے ظلم کئے ہیں" لاش نے دو قدم آگے بڑھائے اور پھر اس کے خون آلود ہونٹوں سے آواز سنائی دی " ہاں تو ظالم ہے ' ہم یہ ملیں چھین لیں گے اور پھر اس دنیا میں ظلم کا نام و نشان بھی نہ رہیگا مزدور اور سرمایہ دار کا سوال نہ رہیگا ، جو محنت کرے گا وہ زندہ رہے گا تمھاری بنائی دیواریں ٹوٹ جائیں گی "سب ایک دوسرے کے بھائی ہوں گے ۔ لاش اس کے اوپر چڑھتی چلی آرہی تھی ۔

"میرے قریب نہ آ ـــــــ میرے قریب نہ آ ـــــــ"

وہ دہشت ناک آواز میں چلایا ـــــــ اس کے پیر کرسی میں اُلجھ گئے۔

"مجھے بچاؤ ـــــــ مجھے بچاؤ ـــــــ وہ بیہوش ہو کر گر پڑا۔

رامو دودھ کا گلاس ہاتھ میں لئے تیز تیز قدم اٹھاتا چلا جا رہا تھا۔ داس کی چیخیں کمرے سے نکل کر سڑک تک دکھائی دے رہی تھیں

"اے بھگوان ـــــــ سیٹھ جی کو کوئی مار رہا ہے" ـــــــ

وہ گھبرا گیا۔ سیٹھ کے دروازہ کی طرف بڑھا ـــــــ اندر جا کے دیکھے پر سیٹھ کی کوٹھی ہے کوئی چور سمجھ کے پکڑ نہ لے۔ اور یہ دودھ ـــــــ رویا کی ماں بھوکی ہو گی ـــــــ وہ رک گیا ـــــــ نہیں وہ دیکھے گا چاہے کچھ بھی ہو، کوئی سیٹھ کو مار رہا ہے۔ آواز تو سیٹھ ہی کی تھی۔

رامو دروازہ کے قریب گیا، آہستہ سے ڈرتے ڈرتے اندر جھانکا کوئی بھی تو نہیں ـــــــ دالان خالی ہے۔ یہ" ـــــــ

اس نے ایک قدم آگے کو بڑھایا "سیٹھ جی ـــــــ اُس کے منھ سے نکلا۔ کوئی مار کے ڈال گیا سیٹھ جی کو ـــــــ وہ ڈرا ـــــــ

"مجھے بچاؤ ـــــــ مجھے بچاؤ ـــــــ داس چلایا۔

"یہ تو زندہ ہیں" ـــــــ

"کیا بات ہے سیٹھ جی" ـــــــ وہ ہمت کر کے اندر گیا۔

"تو ـــــ تو ـــــ رامو ـــــ تو بھی مجھے مارنے آیا ہے؟"

"نہیں سرکار ـــــ کیسا جی ہے سرکار ـــــ"

مگر بھگوان داس تو پاگل ہو رہا تھا۔ اس نے شاید سنا بھی نہیں کہ رامو نے کیا کہا۔

"رامو ـــــ رامو مجھے بچاؤ ـــــ وہ دیکھو کون میری طرف بڑھ رہا ہے۔ اس کی آنکھوں کے شعلے مجھے جلائے ڈال رہے ہیں۔ بھگوان کے لئے مجھے ـــــ مجھے یہاں سے لے چلو۔ میں نے اس سنسار میں بڑے پاپ کئے ہیں پر میں اب کسی کو دکھ نہیں دوں گا۔"

رامو آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھنے لگا ـــــ یہاں تو کوئی بھی نہیں ـــــ

"وہ کون ہے ـــــ دیکھو وہ کون ہے ـــــ لاش زندہ لاش ـــــ اب یہ مجھے کھا جائے گی۔ آگ ـــــ آگ ـــــ آگ میں جل رہا ہوں۔"

"رامو نے دودھ کا بھرا ہوا گلاس، داس کے منہ سے لگا دیا۔

سورج ڈوب رہا تھا، دور افق میں شفق ڈوب رہی تھی، سرخ سرخ جیسے ہولی کا رنگ اڑ رہا تھا ہو آج دن بھی تو ہولی ہی کا تھا۔ جگہ جگہ رنگ کھیلا جا رہا

تھا۔ رامو ادھر ادھر دیکھتا ہوا چلا جا رہا تھا ـــــــــ اس کے ایک ہاتھ میں ہنسیا تھی اور دوسرے میں لال کرتا ـــــــــ لال کرتا اور ہنسیا ـــــــــ اس نے ہنسیا کو ایک بار غور سے دیکھا جیسے وہ اس کی قوت پر مغرور تھا۔ معاً اس کے ذہن نے ہنسیا کے ساتھ ساتھ ہتھوڑے کی شکل بنائی۔ ہاں اس روز مل میں نوجوان آئے تھے۔ ان کا جھنڈا بھی تو لال رنگ کا تھا، جیسے یہ کرتا جھنڈا بن گیا ہو، ہنسیا ہتھوڑا اور لال کرتا ـــــــــ اگر اس کے سر پہ گٹھری نہ ہوتی تو وہ شاید اکڑ کر چلتا۔ کتنے دنوں بعد اس کو اپنی قوت کا احساس ہو رہا تھا۔ جیسے وہ کسی انقلابی تحریک کا علم بردار ہو ـــ

وہ زندگی میں شاید پہلی بار خوش ہو رہا تھا ـــــــــ کیسی خوش ہوگی رویا ـــــــــ ہولی کے دن لال کرتا پہن کر وہ اپنی چاچی کو دکھانے ضرور جائے گی کتنے دن بعد آج وہ اس کے لئے لال کرتا لا سکا ہے ـــــــــ اس کی رویا اسے پہن کر کتنی سندر معلوم ہوگی، وہ چلتے چلتے ہنس پڑا۔ سڑک پہ کتنے لوگ جا رہے تھے۔ کوئی سوچے گا کہ یہ آدمی دیوانہ ہے جو بلا بات کے ہنس رہا ہے۔ بلا بات کے، کتنی بڑی بات ہے۔ کتنے دنوں بعد آج اس کی دلی آرزو پوری ہوئی ہے اس کا جی چاہ رہا تھا کہ وہ اڑ کر پہنچ جائے اور اپنی رویا کو لال کرتا دیدے اس کو کیا معلوم کہ میں اس کے لئے کرتا لا رہا ہوں۔ یوں تو اس نے پہلے بھی کتنی بار کہا تھا کہ آج ضرور کرتا لا کر دے گا پر پیسے کی نہ ہونی تھی کہ جو آج تک نہ

لاسکا ـــــــ آج صبح اس کی روپا نے کہا تھا " بابو جی روج ایسے ہی کہتے ہو" ـــــــ کاش وہ سیٹھ کی طرح رئیس ہوتا اس کے پاس بھی دھن ہوتا کوٹھی ہوتی تو وہ اپنے بچوں کو کتنے ٹھاٹھ سے رکھتا۔ وہ اپنے بچوں سے کتنی محبت کرتا ہے۔ پر وہ کیا کرے اس کے پاس سیٹھ جیسا دھن بھی تو نہیں جو اپنے بچوں کی مانگ پوری کرتا۔

جو کا گٹھر ایک طرف کو جھک گیا تھا۔ اس نے سر کو جھٹکا دیا۔ بوجھ سیدھا کر کے پھر چلنے لگا۔ آج گھر کتنا دور ہو گیا تھا۔ چلتے چلتے وہ تھکا جا رہا تھا۔ اس کے پر ہوتے تو وہ اڑتا ہوا چلا جاتا۔ پھر تو وہ بڑی جلدی گھر پہنچ جایا کرتا تھا۔

"بابو جی آ گئے" نرمل کودتا ہوا گھر میں چلا گیا ـــــــ رامو چونک پڑا وہ دروازہ کے پاس پہنچ چکا تھا۔ اس نے دروازے میں قدم رکھا ہی تھا کہ روپا دوڑی۔ "آ ہا جی میرا لال کرتا" ـــــــ

اس نے ایسا محسوس کیا کہ جیسے وہ رئیس ہے ـــــــ اس وقت وہ اپنی غربت کو بھی بھول چکا تھا۔ وہ اپنے بچوں سے کتنی محبت کرتا ہے ـــــــ اس نے آج اپنی روپا کے لئے لال کرتا خرید اہے ـــــــ

روپا نے کرتا اٹھا کر اپنے سینے سے بھینچ لیا۔ وہ کتنی خوش تھی۔ " بٹیا اسے رکھ کے پانی تو لا دے" پر وہ لوٹے میں پانی لائے تو

تو کیسے لائے۔ ہوا تیزی سے چل رہی تھی۔ کرتا ہوا سے اڑ جائے گا۔ اس نے ہنسیا کو اٹھا کر اس پر رکھ دیا۔ رامو کی نظر لال کرتے پر پڑی ——— اس وقت ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ جیسے ہتوڑا بھی اس پر رکھا ہو ——— ہنسیا ——— ہتوڑا اور لال لال جھنڈا۔

کلرک

گھر بھی تو کتنی دور جا کر ملا ہے ساڑھے چھ بجے تھے جب وہ دفتر سے نکلا تھا اس وقت کتنا اچھا معلوم ہوتا ہے جب وہ دفتر سے نکلتا ہے۔ کتنی بڑی عمارت ہے، کتنے خوبصورت کمرے ہیں۔ اندھیرا تو ضرور ہے مگر بجلی کی روشنی اس کمی کو پورا کر دیتی ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جیسے ساری عمارت میں آگ لگی ہو۔

اور جب وہ وہاں سے نکلتا ہے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جیسے دوزخ سے جنت میں آگیا ہو۔ لیکن آج تو عین وقت پہ ایسا کام آگیا کہ دیر ہو گئی کہیں ساڑھے چھ بجے جا کر فرصت ملی ——— دفتر کا خیال آتے ہی اس کے

بدن میں جھرجھری سی آگئی اونھوں ——— یہ بھی کوئی بات ہے۔ ہر وقت
دفتر ہی دفتر جیسے کوئی بات ہی نہیں رہ گئی ——— اطہر دفتر کو اس وقت بھول
جانا چاہتا تھا مگر یہ بھی تو اس کے پیچھے جن بھوت ہو کر پڑ گیا تھا ——— سپاہی
کی صورت دیکھ کر رک گیا ——— کتنی بھیڑ ہے اس سڑک پر ——— کتنے
جا چکے اور کتنے کلرک جا رہے ہیں ——— سائیکل سوار ——— تانگے سوار
——— پیدل سوار ——— اونھوں ——— پیدل ———
وہ گھبرا سا گیا ——— اور کیا ستر روپیہ کی نوکری میں پیدل نہیں جائے گا تو۔
اس کے لئے موٹر آئے گی، نوجوانوں کو حقیقتوں کی تلخی اتنی شدت سے کیوں
محسوس ہوتی ہے اور پھر اس سے وہ گھبراتے بھی تو ہیں ——— یہ بھی جیسے
کوئی فلسفہ ہے ——— ہاں خیر چھوڑو اسے ہاں تو کتنے آدمی ———
آدمی ——— اونھوں۔ کلرک جا چکے مگر یہ سلسلہ ختم ہی نہیں ہوتا۔ ایسا
معلوم ہوتا ہے کہ جیسے سارا دلی کلرکوں سے بھرا پڑا ہے ——— سچ سچ
سارا ہندوستان ان دنوں کلرک ہو رہا ہے ——— اس کے ذہن میں ایک
وسیع میدان آگیا۔ جس میں کلرک ہی کلرک بھرے پڑے ہوں کوئی دھوتی
کوٹ پہنے ——— کوئی شیروانی پاجامہ پہنے اور کوئی سوٹ میں
——— اس کی نظر معاً اپنے پتلون پر پڑی کتنا خوبصورت تھا یہ پتلون
——— اور یہ سارا سوٹ کتنا اچھا معلوم ہوتا تھا پچھلے سال ہی تو سلوایا ہے جب

بی، اے میں تھا۔ کوئی زیادہ دن بھی تو نہیں ہوئے لیکن صورت دیکھئے۔ جب سے ملازم ہوا۔ اس کی شگفتگی بھی ختم ہوگئی اور اب تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جیسے جسم پر لٹکا ہوا ہو اس میں آخر یہ نرمی کہاں سے آگئی ہے۔ اس نے حل کرنے کی تکلیف بھی نہیں کی ——— کتنا دور آگیا اور گھر ہے کہ آنے کا نام ہی نہیں لیتا

بھوک الگ اپنا زور دکھا رہی ہے۔ معلوم نہیں کھانا تیار بھی ملے گا یا نہیں اس کی بھی اچھی خاصی مصیبت ہے۔ جب سے شادی ہوئی ہے سب مزے ایک ایک کرکے ختم ہو گئے۔ ماں باپ خود تو چل دے اور مجھ کو الگ عذاب میں ڈال گئے

اطہر کو غصہ آنے لگا، کتنی دیر ہوگئی اور ابھی معلوم نہیں کب تک وہ گھر پہنچے گا۔

اور پھر کھانا کھانے کے بعد بھی تو آرام میسّر نہیں ——— یہ مسلیں ——— کلرک ——— اور وہ بھی جنگ کے محکمے میں ——— صبح سے شام تک دفتر میں رگڑا اور رات کو گھر میں ——— اور ہاں پھر تیل کا بھی تو انتظام کرنا ہے۔ وہ بھی ختم ہوگیا۔ آج یہ کام کیسے ہوگا ایک مصیبت ہو تو بھگتی بھی جائے ——— یہ مسلیں۔ میرا تو ناک میں دم ہے جب دیکھو چلی آرہی ہیں پھر یہ ہری اور لال چٹیں بھی تو اتنی تعداد میں ہیں کہ کوئی حد نہیں؛ شائد ہی کوئی فائیل ان سے بچتی ہوگی۔ خدا جانے یہ اتنی تعداد میں چھپوائی کیوں جاتی ہیں۔ سب کہتے ہیں کہ کاغذ کی کمی ہے ملتا نہیں۔ لیکن پھر یہ کہاں سے آتی ہیں کتنا کاغذ اس میں لگ جاتا ہوگا بیکار، محض بیکار ——— گورنمنٹ بھی کتنی فضول خرچ ہے ———

ویسے تو ہر طرف بورڈ لگے ہیں "کم کاغذ خرچ کرو" جس کمرے میں جاؤ یہی لگا ہے۔ کل تو میں نے اسے الٹ ہی دیا۔ اس کی نظر ایک فائیل پہ پڑی۔ جس پر ہری اور لال چٹ دونوں لگی ہوئی تھیں۔ اچھا ایک ہی فائیل پہ دو چٹیں ـــــ خوب یہ بھی ایک ہی رہی۔ یہ تو بالکل ہی فضول خرچی ہے۔ بھلا دو چٹ ایک ہی فائیل پہ ـــــ ضروری بھی ـــــ اور پھر "جلدی" ـــــ ہر کام ضروری ہے۔ کون سا ضروری نہیں ہے۔ ارے بھائی نوکری کی ہی اسی لئے ہے کہ کام کریں اتنا کام اور ستر روپیہ ـــــ بھوک کے غلبہ نے اس کو دوبارہ آدبوچا ـــــ بھوک ـــــ بھوک ان لوگوں کا خدا جانے کیا حال ہوگا جو روز بنگال میں بھو کے مرتے ہیں۔ کتنے وقت انہیں کھانے کو نہیں ملتا۔ اس نے تو صرف آٹھ ہی گھنٹے سے کچھ نہیں کھایا ـــــ خوب اس وقت اس کے سامنے ایسی شکلیں آئیں ـــــ بھوک سے نڈھال ـــــ ننگے جسم پہ چیتھڑا تک پیٹنے کو نہیں۔ ان عفریت شکل انسانوں کو دیکھ کر اس کے جسم میں کپکپی سی اٹھی ـــــ ہڈیوں کا ایک انبار ـــــ اس کے جسم کا رواں رواں کھڑا ہو گیا ـــــ وہ ان شکلوں سے ان ہڈیوں سے گھبرا سا گیا ـــــ یہ شکلیں اسے بار بار پریشان کرتی ہیں ـــــ ہڈیوں کا ایک پہاڑ ـــــ وہ محسوس کرنے لگا کہ جیسے اس کا جسم بالکل ننگا ہے ـــــ پھر سردی بھی لگ رہی ہے۔ مگر وہ تو کوٹ پہنے

ہے ـــــ گرم ـــــ اس کو غصہ آیا ـــــ یہ شکلیں اس کے دماغ پہ بری طرح حاوی ہوگئی ہیں آخر وہ ان سے کیسے پیچھا چھڑائے ۔ چاروں طرف ہڈیاں ہی ہڈیاں ـــــ معلوم نہیں کہ کسی مسلمان کی یا ہندو کی ۔ کسی بھوکے کی ـــــ اس نے پیر اٹھا کر چلنا شروع کر دیا۔ وہ آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر سڑک کے چاروں طرف دیکھنے لگا ـــــ کچھ بھی تو نہیں سمنٹ کی چکنی سڑک ـــــ کالی کالی ـــــ شام کتنی تیزی سے بڑھ رہی تھی ، اب تو رات ہونے والی ہے ـــــ گھر آنے کا نام نہیں لیتا۔ ـــــ دو موڑ تو اور باقی ہیں ۔ اس کی نظر ایک عمارت پہ پڑی ـــــ روزانہ یہی عمارت ، یہی سڑک ـــــ آج چھ مہینے ہو گئے ـــــ روزانہ صبح شام اسی سڑک پہ سے جاتا ہوں ۔ یونیورسٹی میں جب تھا ۔ تب بھی تو دو سال مستقل ایک ہی سڑک پہ چلا تھا ، مگر وہاں مطلق اس کا احساس نہیں ہوتا تھا ۔ اور یہاں چھ مہینے میں یہ حال ہو گیا ـــــ آخر زندگی کیسے گزرے گی ـــــ یہ بھی کوئی زندگی ہے ۔ جس میں کوئی ہما ہمی نہیں ـــــ سارے دفتر کا یہ حال ہے ـــــ ہر کلرک کی زندگی بالکل یکساں سپاٹ ـــــ جس میں کوئی تبدیلی نہیں ـــــ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جیسے مردوں کو قبرستان سے نکال کر کرسیوں پر بٹھا دیا بے حس ـــ پژمردہ ـــــ زندگی کے دور دور آثار نہیں کسی کی طبیعت میں کوئی اُبال نہیں ـــــ مل کے مزدور ـــــ

نگران کے اندر بے حسی تو نہیں ـــــــــ ان میں بغاوت کا احساس تو ہے کبھی کبھی ہڑتال بھی کر دیتے ہیں مگر عرصے سے انھوں نے ہڑتال بھی نہیں کی آخر کیا بات ہے کیا وہ بھی کلرک ہو گئے ـــــــــ لیکن یہ لوگ بھی بڑے منظم ہیں۔

ـــــــــ اس کا دماغ بالکل بیکار ہو گیا تھا ـــــــــ اس نے سوچا کہ اسے تھوڑی دیر تو آرام کرنے دے۔ مگر یہ دماغ بھی چین سے بیٹھتا تو نہیں ـــــــــ ہر وقت کچھ نہ کچھ سوچتا ہی رہتا ہے۔ لیکن جوں ہی اس نے اپنے دماغ کو تھوڑی دیر کے لئے آزاد کیا۔ بھوک نے دوبارہ اس پہ اپنا تسلط جمالیا ـــــــــ معلوم نہیں کھانا تیار ملے نہ ملے ـــــــــ پھر ترکاری کا بھی تو اعتبار نہیں۔ اور ہاں بیگم صاحبہ نے تو صبح ہی نوٹس دیدیا تھا کہ ترکاری ختم ہو گئی۔ شام کے لئے دفتر سے لوٹتے میں لیتے آنا۔ اس کی جیب میں دو آنے پڑے تھے۔ یہیں ذرا آگے سے لیتے چلیں گے تو اس کے معنی یہ ہوئے کہ بس کھانے سے بھی ہاتھ دھو کے کہیں نو بجے تک کا انتظام ہو گیا۔ یہ بیگم صاحبہ بھی بس میری مصیبت ہیں یہ شادی وبال جان ہے پھر یہ بھی کہ سلیقہ کی بیوی ہوتی تو کوئی بات بھی ـــــــــ یہاں یہ حال کہ ہر وقت غصہ ہی آتا رہتا ہے ـــــــــ آخر کوئی حد بھی تو ہو، میری زندگی سب سے خراب ہے۔ ایک روز بھی تو ہنسی خوشی سے بات نہیں کرتی۔

ہر وقت تو کسی نہ کسی بات پہ تاؤ آتا رہتا ہے۔ مجھ سے تو نفرت کرتی ہے مگر نفرت کیوں؟ کہیں ایسا تو نہیں کہ کسی اور سے محبت کرتی ہو مگر شادی مجھ سے ہو گئی

اس کو خود بخود اپنے اس واہمہ پر ہنسی آ ئی، لیکن یہ بات بھی تو غلط نہیں معلوم ہوتی آخر وہ بھی لڑکی ہے، کسی نہ کسی سے تو محبت کرتی ہی ہو گی، اسے اپنے ماضی کا ایک معاشقہ یاد آیا ویسے تو معلوم نہیں، اس نے کتنوں سے محبت کی تھی مگر نعیمہ

——— یہ لونڈیا بھی خوب تھی، ہر وقت تو ہنستی رہتی تھی۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جیسے سوائے ہنسنے کے کوئی کام نہیں، بڑی تفریح کی اور تھی بھی کتنی آزاد خیال ——— میری دعوت بھی تو کیا کرتی تھی بڑی بے تکلف ———

اس کو اپنے ماضی کی لطیف صحبتیں ایک ایک کر کے یاد آنے لگیں ———

یہ لڑکیاں بھی بڑی خوشامد کراتی ہیں۔ خود ایک لفظ کہہ کر نہیں دیتیں۔ اور ہم سے سب کچھ کہلوا لیتی ہیں ——— ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جب تک بیویاں نہیں بنتیں ان کے پاس جذبات ہی نہیں ہوتے بالکل بے حس ———

خاموش ——— کتنی ہی شوخ و چنچل کیوں نہ ہو۔ جہاں کوئی بات کہی بس بت بن گئیں۔ مگر یہ تو اپنی ہی حماقت ہے۔ میں چاہتا تو اس سے کہلوا ہی لیتا۔ مگر یہاں انتظار بھی تو نہیں ہوتا ——— کتنا ہی سوچا کہ آج کچھ نہیں کہوں گا۔ مگر وہ تو زبان ایسی ہے کہ خود بخود بیساختہ نکل جاتا ہے

——— کتنے دن نعیمہ کے ساتھ زندگی گزری مگر وہ بھی ہوشیار ہی نکلی۔ اس نے خود کچھ کہہ کر نہیں دیا مجھی سے کہلوایا ——— لیکن یہ بات نہیں، محبت تو مجھ سے بہر حال کرتی ہی تھی اب کوئی لڑکی اپنی زبان سے

کہے دیتی ہے کہ "مجھے جناب سے محبت ہے۔ آپ کے مارے تڑپتی ہوں ——
شب ہجر کاٹے نہیں کٹتی" —— اطہر کو ہنسی آئی۔ یہ بھی کوئی شاعری
ہے۔ جب سے وہ کلرک ہوا ہے اسے شاعروں اور افسانہ نگاروں سے
نفرت سی ہو گئی تھی۔ یہ لوگ کیسی کیسی باتیں لکھتے ہیں جس کا نہ کوئی سر نہ پیر ——
محبت کی داستانیں میاں ہم ڈھونڈھتے ہی رہ گئے۔ آج تک کوئی ایسی شاعرانہ
لڑکی نہ ملی۔ معلوم نہیں ان کو ایسی کہاں مل جاتی ہیں۔ یہاں تو جو بیوی بھی ملی ہے
وہ بھی ایسی کہ محبت کا نام ہی نہیں جانتی لیکن اب ایسا بھی کیا اگر مجھ سے محبت نہیں
کرتی تو کیا کسی سے نہ کرتی ہوگی۔ اس کی صورت ہی سے معلوم ہوتا ہے کہ ضرور
کسی نہ کسی سے محبت کرتی ہے —— اطہر کا غصہ بڑھتا چلا جا رہا تھا اس
نے اپنی مٹھیاں بھینچ لیں۔ یہ بھی کوئی بیوی ہے جو اپنے شوہر کے بجائے کسی
اور سے محبت کرے۔ بھلا اس کو کون ساحق ہے اگر ایسا ہی محبت کرتی تھی تو مجھ
سے شادی ہی کیوں کی —— کبھی ہنس کر بات نہیں کرتی آخر ہماری بھی تو طبیعت چاہتی
ہوگی کبھی ہنسنے کی، دن بھر فائلیں پیٹیں اور پھر اس وقت بھی جلی کٹی باتیں سنیں کس کی طبیعت
نہیں چاہتی اس کی بیوی اس سے محبت کرے۔ پھر کس کی بیوی اس سے محبت نہیں کرتی
لیکن یہاں تو سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔ بھلا یہ بھی کوئی بیوی ہوئی جو محبت نہ کر سکے۔ ضرور کسی نہ کسی کو چاہتی
ہے اسکو یقین ہو چکا تھا کہ اس کی بیوی کسی اور سے محبت کرتی ہے اچھا آج وہ معاملہ صاف کرے گا معاملہ
ویسے بھی صاف ہے۔ روزانہ جھگڑا —— روزانہ جھگڑا —— ہر وقت
طعنہ دیتی ہے۔ "میاں کے پاس کھانے کو نہیں اور شادی کا شوق چرایا اور بھی کوئی المقد

ماری نہیں بی ۔اے کر کے میری قسمت پھوڑ دی چالیس روپلی تو بچے ہیں اس پر یہ حال ہے!"

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جیسے اس کا دماغ ماؤف ہوگیا ہے وہ کیا جواب دے

نام کو ستر روپیہ ملتے ہیں مگر نہیں روپیہ تو قرضے ہی میں نکل جاتے ہیں بھلا اس گرانی میں

اتنے میں کہاں گذر ہوتی ہے پھر اماں نے یہ اور مصیبت کر دی کہ ایک وبال گلے میں

ڈال دیا ——— اسے کیا خبر تھی کہ بیوی بھی آئیں گی تو ماشاء اللہ ایسی کہ یہ حال کر دینگی

اس وقت اس کو روپیہ کی ضرورت نہ تھی وہ محبت چاہتا تھا ——— شادی

کرتے وقت اس کے ذہن میں یہ آیا بھی نہ تھا کہ اس کی بیوی اس سے محبت نہ کر سکے گی

کتنی لڑکیوں سے وہ محبت کر چکا تھا لیکن پھر بھی وہ محبت کا بھوکا تھا لیکن حقیقت یہ ہے

کہ روپیہ کے سامنے محبت کے تمام نظریے بیکار محض بیکار ——— محبت وحبت

کچھ نہیں، سب ڈھونگ ہے ڈھونگ، اصل چیز روپیہ ہے روپیہ۔ آج اس کے پاس

روپیہ ہو تو محبت کی کمی نہیں ——— یہ تو نئی دل ہے کہ لڑکیاں آنکھ اٹھا کر بھی

نہیں دیکھتیں روپیہ ہو تو وہ بھی پیچھے پیچھے پھریں ——— ان لڑکیوں کا کیا

کہنا ——— ان کے غرور کی تو کوئی حد ہی نہیں۔ ان کی طرف دیکھو تو منہ

پھیر لیتی ہیں۔

اس نے سر اٹھا کر دیکھا۔ مکان سامنے نظر آرہا تھا۔ کمرے والا کمرہ اس کا اپنا ہے

بیگم صاحبہ بیٹھی ہوں گی۔ بیوی کا خیال آتے ہی اس نے اپنے آپ کو تیار کرنا شروع کر دیا

——— ہر وقت غصہ ——— آج ہم بھی دیکھیں گے بیگم صاحبہ کا غصہ

______ آخر ہم نے بھی تو ان کی کمزوری پکڑی ہے۔ مت کرو محبت ــ
جیسے ہم ان کی محبت ہی پر تو زندہ ہیں ______ مکان کی سیڑھیاں آگئیں۔
اطہر نے چڑھنا شروع کر دیا۔ اس کو یہ بھی احساس نہیں تھا کہ وہ کہاں جارہا ہے
اس وقت اس کا سارا جسم غصہ سے تھرتھر کانپ رہا تھا، بھوک الگ پریشان کر رہی تھی
ارے ترکاری لانا تو بھول ہی گیا۔ اس کے غصہ میں اور اضافہ ہو گیا۔ بھلا اکیلا آدمی
کیا کیا کرے۔ کاش وہ خودکشی کر سکتا ______ ہوں ______ ہوں ____
کمرے میں کسی کے بولنے کی آواز آ رہی تھی۔ اطہر رک گیا۔ کمرہ اندر سے بند
معلوم ہوتا ہے۔ " اچھا، اس نے دل ہی دل میں کہا، معلوم ہوتا ہے کہ جیسے
کوئی صاحب تشریف رکھتے ہیں۔ اس نے غور سے سننا شروع کر دیا۔ اس کی بیوی کے
بولنے کی آواز آ رہی تھی۔ مگر یہ دوسرا کون ہے ______

"مگر وہ بھی کیا کریں۔ دن بھر تو دفتر میں کام کرتے ہیں۔ اب بھی تو نجو رہی ہے"
یہ آواز اس کی بیوی کی تھی ..

"لیکن آپا۔ تم کو یہاں کتنی تکلیف ہے۔ چلو نا، اماں نے خود ہی کہا تھا: کہ
شاہدہ کو بھی اپنے ساتھ لیتے آنا اور اب تو میں آپ کو یہاں چھوڑنے سے رہی۔"
______ یہ دوسری آواز تھی۔

"پھر وہی بات ______ اتنی دیر سے بکواس کر رہی ہوں۔ اری بھنو
اگر میں چلی جاؤں گی تو کھانے کا انتظام یہاں کون کرے گا۔ کتنی دیر سے تھک تھکا کر

تو آتے ہیں۔ اگر اب بھی کھانے کو نہ ملے تو کتنی پریشانی ہو ــــــــ

"ہونے دو"

"تیرے کہنے سے"

"اُفوہ! بڑی محبت کرتی ہیں۔"

"تو کیا غلط کہہ رہی ہوں، تیری شادی ہو جائے گی تو تو بھی ایسا ہی کرے گی۔"

"تو جانے دو، میں کلرک سے تو کرنے کو رہی" ــــــــ اطہر کا غصہ کافور ہو چکا تھا۔

"نہیں تو تیرے لئے بڑا کوئی کلکٹر آئے گا جبھی کرے گی۔"

اطہر نے دروازہ پر ہاتھ مارا اور اندر داخل ہوا۔

"اہا ــــــــ دولھا بھائی آپ آگئے۔ کہئے کہاں تھے بیگم صاحبہ انتظار کرتے کرتے تھک گئیں۔"

"چپ" شاہدہ نے آہستہ سے چٹکی لی۔

"اچھا۔ آپ ہیں۔ سالی صاحبہ۔"

"پھر وہی آپ نے گالی دی ــــــــ دیکھو آپا منع کر لو اپنے میاں کو۔"

"تو کوئی میں جھوٹ بات کہہ رہا ہوں۔ جو آپ زبردستی بگڑ رہی ہیں۔"

"اچھا جائیے، نہیں بولتی۔ کسی کے یہاں کوئی مہمان آتا ہوگا تو وہ خاطر کرتا ہوگا اور یہاں آپ نے دروازے سے داخل ہوتے ہی گالی سنائی۔"

الطاف نے فائل میز پر ٹپک دی۔ اس کا غصّہ ختم ہو گیا تھا۔ اب وہ شاہدہ کو کچھ نہیں کہے گا۔

سندر ناری

چمپی نے سونا کو جھولی اٹھاتے دیکھ لیا اور وہ کھیلتے کھیلتے دوڑی۔

"دیدی ——— میں بھی چلوں گی دیوالی دیکھنے" وہ بہن کے گلے میں لپٹ گئی اور ہٹ کرنے لگی۔"

"چمپی تو بڑی ہٹی ہے۔ دیکھ ماں سارے دن اکیلی رہے گی، میں شام کو تیرے لئے چیزیں لاؤں گی۔"

"اول ——— اونہ ——— میں نہیں ——— میں تو جاؤں گی۔"

سونا نے جھولی ایک طرف کو رکھ دی "اچھا بتا کیا کھائے گی میٹھے سیل لے گی۔ میری چمپی سیل کھائے گی"، سونا نے بہن کو گود میں اٹھا لیا اور بہلانے لگی۔

"اری سونا ——— آج یہیں شام کر دیگی کیا؟"

اندھے نے لاٹھی کو زمین پر ٹیکتے ہوئے کہا۔۔

"چل رہی ہوں بابا! ——— چمپی لپٹ رہی ہے۔"

چمپی تو بڑی ہٹ کرنے لگی ہے۔ سونا کو جانے نہیں دے گی تو رات کو کھائے گی کیا ——— تیرے لئے لڈو لائے گی سونا ———

بڈھے نے چمپی کو بہلانے کی کوشش کی۔

"میں تو نہیں" ——— چمپی اور لپٹ گئی۔ "تو تو روج جاتی ہے، اور مجھے نہیں لے جاتی۔ چمپی مچل مچل کر بہن کو لپٹ رہی تھی، کچھ بھی ہو وہ تو جا کے رہے گی۔ اور آج ہی کیا وہ تو روز ہی اسی طرح ہٹتی تھی۔ اس کو بڑا غصہ آتا تھا کہ آخر سونا ہی میں کون سی ایسی بات ہے جو روز جاتی ہے اور وہ کیوں نہیں جا سکتی۔ جب سونا جھولی اٹھاتی تو چمپی اس کو لپٹ جاتی۔ کتنی کتنی دیر وہ اس کو نہ چھوڑتی سونا بہلاتی پھسلاتی اور جب کسی طرح نہ مانتی تو وہ چھوڑ کر چلی جاتی۔ اور چمپی گھنٹوں اس بات کو نہ بھولتی۔ کھیلتے کھیلتے بھی اسے یاد آجاتا تو وہ بڑبڑانے لگتی۔ اور جب سونا واپس آتی تو معلوم نہیں کب سے دوارے میں بیٹھی اس کی راہ تکتی ہوتی ——— سونا پیسے ماں کے ہاتھ میں دیدیتی اور

کھانے پینے کی چیزیں چمپی کے حوالے کر دیتی، روٹی کے ٹکڑے، پکے ہوئے چاول ــــــ سالن سنی ہوئی روٹیاں، حلوہ کی ڈلی، سنگترہ کی پھانکیں، بھنے ہوئے چنے، ٹکیاں ــــــ مٹھائی کا چورا۔ اور چمپی خوش ہو ہو کر کھانے لگتی۔

اب جوں ہی اس نے دیکھا کہ سونا جا رہی ہے پھر وہی ضد لگائی۔

" اری سن تو! ــــــ روشنی تو رات کو ہوگی اور میں تو ماں کے لئے دوا لے کر شام ہی کو آجاؤں گی۔"

" تو پھر میں کب دوالی دیکھوں گی؟" چمپی نے منہ پھلا کر پوچھا

" کل کو دکھا دیں گے ــــــ جا کھیل تیرے لئے مٹھائی لا دونگی۔"

" مٹھائی"؟ ــــــ چمپی نے خوش ہو کر پوچھا

" پیڑا لاوں گی" ــــــ

" ہاں، پیڑا ہی لا دوں گی" ــــــ

اندھا لاٹھی ٹیک کے کھڑا ہو گیا " سونا اپنے پتی کے چلی جاوے گی، تو پھر کون دوالی دکھایا کرے گا؟" بڈھے نے اپنی بے نور آنکھیں چمپی کے چہرہ پہ گاڑ دیں۔

سونا نے جھری اٹھائی۔ اور پھریاں کو جھک کے دیکھا۔ اس کے کھانگو جیسے سینہ میں سانس انجن کی طرح چل رہا تھا۔

"دوا ـــــــ مت ــــ بھولیو ـــــ" ماں نے کراہتے ہوئے آہستہ سے کہا۔ اور سونا اندھے باپ کی لاٹھی پکڑے باہر نکل گئی۔

چراغ جل چکے تھے۔ سونا اندھے باپ کے ساتھ گھر کو لوٹ رہی تھی۔ اس نے اپنی مٹھی کھول لی مدھم روشنی میں زرد زرد روپیوں میں سفید چونی چمک رہی تھی۔ وہ چلتے چلتے رک گئی اور مڑ کر دیکھنے لگی۔ زمیندار کے لڑکے کا کمرہ سامنے دکھائی دے رہا تھا۔

"چل بیٹی! ـــــــ اندھا بولا ـــــــ

اور سونا چلنے لگی۔ اس کی کنپٹیوں سے ابھی تک آگ سی نکل رہی تھی اور گال بھی جل رہے تھے، معلوم نہیں آج اس نے کیا کھو دیا تھا جس کے لئے وہ کچھ اداس ہو رہی تھی۔ ہر روز گھر واپس جانا اس کا معمول تھا اور وہ راستے بھر باپ سے طرح طرح کی باتیں کرتی چلی جایا کرتی تھی وہ ایک منٹ بھی تو خاموش رہنا نہیں جانتی تھی۔ لیکن آج جیسے وہ بولنا بھول گئی ہو اس کے ہونٹ کھلتے اور پھر ایک دوسرے سے پیوست ہو جاتے۔

"دیوالی کے چراغ جل گئے بیٹی؟ ـــــــ اندھے نے پوچھا۔

"ہاں ـــــــ اس نے بے دلی سے جواب دیا۔ آج اس کا جی بولنے کو نہیں چاہ رہا تھا۔ وہ خیالات کے اتھاہ سمندر میں ہچکولے کھا رہی تھی۔

وہ ایک ننھے پرندے کی مانند تھی۔ جس کے پر بھیگ چکے تھے اور اس سمندر میں لاکھوں اژدہے اس کو گھیرے ہوئے تھے۔ موٹے موٹے بڑے بڑے پیٹ والے خوفناک صورت منہ پھیلائے اس کی طرف بڑھ رہے تھے۔ بھلا کوئی ان سے پوچھے کہ ایک حقیر سی جان کو کھا کر تمھیں کیا ملے گا ـــــ تمھارا پیٹ تو بھر نہیں جائے گا تمھاری بھوک ختم نہیں ہوگی۔

"آج تیرا جی کیسا ہے سونا؟" ـــــ باپ نے اس کی خاموشی سے گھبرا کر پوچھا۔

"اچھی تو ہوں بابا" ـــــ اس نے چونک کے جواب دیا۔ وہ آج ماں کے لئے دوا بھی نہ لا سکی۔ اسے وقت کہاں ملا۔ جو دوا لینے جاتی۔ شام ہو گئی تھی۔ اس وقت تو کہاں ملتی۔ معلوم نہیں اس کی ماں کا کیا حال ہوگا۔ آج تو اس سے بولا بھی نہ جا رہا تھا ـــــ ہائے اس نے کتنا برا کیا جو اپنی ماں کے لئے دوا بھی نہ لائی ـــــ پر وہ لاتی تو کیسے ـــــ اس کی آنکھوں میں اداسی ناچ رہی تھی۔ اس کے دھوتی کا پلو سر سے اتر گیا تھا جیسے وہ خواب میں چل رہی ہو۔ معلوم نہیں کیوں کچھ دنوں سے جب وہ سڑک پہ چلتی تو اپنی میلی کچیلی دھوتی کو اچھی طرح جسم سے لپیٹ لیتی۔ اور اگر پلو سرک جاتا تو پھر ٹھیک کر لیتی۔ وہ شرما سی جاتی۔ کہیں کسی نے اسے دیکھ تو نہیں لیا۔ اور اس کے دل میں جیسے کوئی ہلکے ہلکے چٹکیاں سے رہا ہو۔ وہ ایک لذت محسوس کرتی اور اس کا دل چاہتا کہ پھر

اسی طرح اس کا پلّو اتر جائے ۔ مگر آج وہ کھوئی کھوئی سی تھی اس کی دھوتی کا پلّو کب سے لٹک رہا تھا ۔ مگر اسے اس کا احساس ہی کب تھا ایک ہات میں جھولی اور ایک سے اندھے باپ کی لاٹھی تھامے ہوئے سڑکوں بیچ در بیچ گلیوں سے گزرتی ہوئی چلی جا رہی تھی ۔ چونّی اس کے ذہن میں گھوم رہی تھی ۔ اس نے پھر اپنی مٹھی کھولی اور بند کر لی ۔ اس کو آج کیا ہو گیا ۔ وہ ایسا محسوس کر رہی تھی کہ ادھر سے ہر گزرنے والا پوچھ رہا ہے ۔ "آج یہ اداسی کیوں ؟" زمیندار کی کوٹھی اس کی آنکھوں کے سامنے چکر کھانے لگی ۔ خوبصورت کمرہ ، مسہری ، بستر اور زمیندار کا لڑکا ۔ گورا رنگ لمبا قد ، موٹا تازہ ، اس کے قوی بازو ——— ہے بھی تو دیو کا دیو ، اس نے دل ہی دل میں کہا ۔ اور وہ اپنے آپ کو ایک چڑیا کی طرح محسوس کرنے لگی ۔۔ شکرے کے پنجے میں چڑیا بھی تو ایسے ہی پھڑپھڑاتی ہے اور پھر وہ اس کے پر نوچ ڈالتا ہے ، وہ اس کے پنجوں سے نکل نہیں سکتی ۔

"آج تو تھک گئی معلوم دے ہے ——— بٹیا !" ——— باپ نے پھر پوچھا ۔

"ہاں میرے پیر دکھ رہے ہیں بابا" ——— سونا نے ٹالنے کے لئے کہا ۔

"اپنی ماں کی دوا بھی لے لی ہے" ——— اس نے پھر پوچھا

"کہاں لی ہے ——— دکان بند تھی بڑی دیر راہ تکی ۔ اسی میں تو اتنی

دیر لگ گئی۔ سونا نے جواب دیا۔ اور پھر چپ ہو گئی۔ اور جلدی جلدی چلنے لگی۔ اس کی روح سماج کے گندے اور گھناؤنے دھاروں میں بہی چلی جا رہی تھی۔ اس کے ہات میں سفید سفید چونی تھی اور جھولی میں مٹھائی کے ٹکڑے ———— وہ مٹھائی چمپی کو دیدیگی، کتنی خوش ہو گی چمپی ———— دوارے بیٹھی راہ تک رہی ہو گی سونا کو دیکھتے ہی دوڑے گی ———— اس کے قدم تیز ہو گئے۔

"گھر آ گیا بیٹی"! ————

"ہاں وہ سامنے ہے۔ چمپی دوارے ہی بیٹھی ہے" ———— سونا یہ کہہ کر اداس ہو گئی۔ چمپی بھی ایک روز میری طرح ان سڑکوں پہ ماری ماری پھرا کریگی ایک پیسہ، ایک چونی میں اس کو بھی اپنا سب کچھ بیچ دینا ہوگا، "اے بھگوان ——— اس کا جسم کانپ اٹھا۔ اس نے اپنی مٹھی کھول کر دیکھی سفید سفید چونی ———— بھگوان نہ کرے وہ میری طرح ہو، وہ ان سڑکوں پر آئے —— اس کی روح سسک رہی تھی، فریاد کر رہی تھی، جیسے اس کا دم گھٹا جا رہا ہو، سانس رک رہا ہو، اس کے دماغ میں جیسے آندھی آ رہی تھی، ایک شور تھا، ایک قیامت تھی ———— زمین پیروں کے نیچے کانپتی معلوم ہو رہی تھی۔ اور اس کے پیر لرز رہے تھے۔ قدم اٹھانا دوبھر ہو رہا تھا۔

"دیدی آ گئی ————" چمپی چلائی اور اس کی آواز سے سونا

چونک پڑی، گھر آ گیا تھا۔ چمپی دوار سے لگڑی انتظار کر رہی تھی۔

"مٹھائی ہے ——— دیدی! ——— اس نے جھولی کی طرف ہاتھ بڑھایا

اور سونا نے جھولی ہاتھ میں دیدی ——— وہ اچھلتی کودتی دوڑ کے گھر میں چلی

گئی اور سونا بھی سر جھکائے گھر میں چلی گئی۔

دن اسی طرح گزرتے رہے۔ ہفتے مہینوں میں تبدیل ہوتے رہے مگر سونا اپنے

جیون کی ناؤ اسی طرح بہائے لئے جا رہی تھی۔ اس کی زندگی نے کوئی نیا روپ نہیں بدلا

تھا۔ دن بھر بھیک مانگنا اور رات کو تھک کر پڑ رہنا اور اب تو اکثر وہ رات کو

بھی نہیں آتی تھی۔ ماں چتا میں سو چکی تھی۔ اندھا باپ بھی اب کھاٹ سے اٹھ نہ سکتا تھا۔

اور اب چمپی سونا کے ساتھ جایا کرتی تھی۔ ایک چھوٹی سی جھولی چمپی کے ہاتھ میں رہتی۔

اور وہ ننھے ننھے ہات اٹھا کر قریب سے گزرنے والوں سے کہتی۔

"بابو جی! پیسہ ———"

"بھگوان تمہارا بھلا کرے گا" ———

اس نے سونا سے بھیک مانگنا اور جھولی گلے میں ڈالنا سیکھ لیا تھا۔ وہ دل ہی دل

میں خوش ہوتی کہ تھوڑے دنوں بعد اس کو بھی بہت سے پیسے ملنے لگیں گے اور وہ سونا

کی طرح مانگنا آ جائے گا۔ وہ سوچتی آخر دیدی کو لوگ اتنے پیسے کیوں دیتے ہیں

گنتی تو میں بھی ہوں۔ مجھے تو دن بھر میں ایک پیسہ بھی نہیں ملتا کہیں کہیں سے اناج یا آٹا

مل جاتا ہے اور دیدی تو کیسی اچھی اچھی چیزیں لاتی ہے۔ وہ گھنٹوں سوچا کرتی۔ مگر کوئی بات اس کی سمجھ میں نہ آتی تھی۔ شاید اس لئے کہ وہ چھوٹی سی ہے، جب بڑی ہو جائے گی تو اس کو بھی پیسے ملنے لگیں گے۔ مگر وہ بھی مطمئن نہ ہوتی۔ آخر بڑے ہونے ہی میں کون سی نئی بات ہو جائے گی۔ ماتنگی تو میں بھی، ایسے ہی ہوں جیسے دیدی ماتنگی ہے۔ مگر اس کی سمجھ میں کوئی خاص وجہ نہ آتی تھی۔ اور پھر وہ اپنے کھیل میں لگ جاتی۔ سونا کی لائی ہوئی چیزیں بڑی خوش ہو ہو کر کھاتی۔

زمیندار کا لڑکا پورن اب بھی اسے طرح طرح کے پھل اور پیسے دیا کرتا تھا۔ وہ جب شام کو گھر واپس ہوتی تو راستہ میں زمیندار کا مکان پڑتا تھا ——— اور پورن اپنے چبوترہ پر ٹہلتا ملتا۔ وہ اسی طرح روز سونا کا انتظار کیا کرتا تھا۔ اور جہاں سونا دور سے دکھائی دی، وہ ہنس پڑا۔ سونا بھی مسکرائی اور چبوترے کی سیڑھیوں پر چڑھنے لگی ——— دن کی روشنی پر اندھیرا چھا گیا، کائنات سو گئی موت کی سی خاموشی ——— ہیبت ناک سناٹا ——— جیسے بجتے بجتے ستار کا تار ٹوٹ گیا ہو۔ نغمہ گم ہو گیا، اور اس کی گونج اب تک فضا پر چھائی ہوئی تھی، درد بھری لہریں، آہیں، سسکیاں، دھیرے دھیرے کائنات میں سرایت کر رہی تھیں ...

"گنگو انتا نہیں، سونا نے پیار سے اس کے بھورے بالوں پر ہاتھ پھیرتے

ہوئے کہا:۔ دیکھ تو کتنا دن چڑھ گیا:۔ گگو نے آنکھیں کھول دیں۔ سونا کا دل باغ باغ ہو گیا جیسے اس کی کائنات آنکھیں ملتے ملتے جاگ اٹھی ہو۔ اس کا بچہ ہی اب اس کے جیون کا سہارا تھا، اس نے اپنے بچے کے لئے کیا کچھ نہیں دکھ جھیلے، جدھر سے نکلتی لوگ انگلیاں اٹھاتے پھر ایک اندھیری رات کو ایک سنسان سڑک پر معلوم نہیں کب تک وہ بیہوش پڑی رہی اور جب اس کو ہوش آیا تو گوشت کا ایک لوتھڑا اس کے پاس پڑا تھا اس کا بچہ ـــــ ماں کی مردہ آنکھیں چمک اٹھیں ـــــ بچہ رو رہا تھا ـــــ بھوکا ہوگا۔ سونا نے اسے اٹھا کے اپنی پھٹی ہوئی دھوتی میں لپیٹ کر سینے سے چمٹا لیا۔ اس کے بھیک کی جھولی بھی قریب پڑی تھی۔ وہ اپنے بچہ کو لیکر کھڑی ہو گئی۔ جھولی بھی اٹھالی اور گھر کی طرف چل دی۔

گنگو کو دیکھتے دیکھتے اکثر سونا کی آنکھیں بھر آتیں وہ سوچنے لگتی، اس کو پورن کے چرنوں میں ڈال آئے۔ میں بھکارن ہوں تو کیا یہ اس کی اولاد ہے۔ کیا اسے اپنی اولاد پر بھی رحم نہ آئے گا۔ مگر پھر دل مسوس کر رہ جاتی۔ بھگوان نے ان امیروں کا دل بھی پتھر کا بنایا ہے۔ پورن کو رحم آتا تو کیا اس روز وہ مجھے اس طرح مار کر نکال دیتا۔ وہی پورن جس نے میرے جیون کی اندھیاری کو دھو دیا تھا۔ وہ مجھ سے سگائی تک کرنے کو کہتا تھا، مگر جب اس نے دیکھا کہ سونا کچھ دنوں بعد ایک بچہ کی ماں بن جائیگی تو اس کو کس قدر غصہ آیا۔ اس نے یہ کہہ کر مجھے اپنے یہاں سے نکال دیا کہ اب کبھی اس کے مکان کی طرف نہ آؤں ـــــ ہائے بھگوان میں پاپی ہوں تو اس بچہ کا کیا

کیا قصور ہے، اس نے تو پاپ نہیں کیا۔" سوچتے سوچتے سونا کی آنکھیں ابا رندی کی طرح امنڈ آئیں ______

گنگو ہمک ہمک کر کھیلتا ____ ہات پیر مارتا ____ ہنستا ____ اور سونا سب کچھ بھول جاتی۔ ماں کی ممتا جوش مارتی، وہ اس کو اٹھا کر چھاتی سے لگا لیتی۔ "میرا گنگو!" وہ پیار کر کے کہتی۔ اس کی ہنسی اس کی کھل کھلاہٹ اور اس کا ہمکنا جیسے ساری فضا میں تیر گیا ہو۔ ایک خوشی ایک سکون ______ اور وہ ان لہروں میں بہنے لگتی ______

آج زمیندار کے لڑکے پورن کی شادی ہو رہی تھی برات چڑھ رہی تھی ہزاروں آدمیوں کا مجمع تھا، ناچ، گانے، جیسے ساری دنیا ایک نغمہ تھی، ایک ناچ تھی، ایک گیت تھی۔ سرمایہ کی دیوی ناچ رہی تھی ______ ناچ ____ ناچ ____ وہ تھک رہی تھی، ہار رہی تھی۔ جیسے ناچتے ناچتے گر پڑے گی ____

اس سے دور ایک ایسی دنیا کی جھلک بھی دکھائی دے رہی تھی جس کے جسم پہ کپڑے نہیں تھے پیٹ بھوکا تھا ______ ایک نوالہ کے لئے ایک پیسہ کے لئے ان کے ہاتھ پھیلے ہوئے تھے۔ سونا اور چمپی کھانا ملنے کی امید میں کھڑی تھیں ______ چمپی کا بچپن ختم ہونے سے پہلے وہ جوان ہو چکی تھی ______ اور سونا جیسے تیز دھوپ میں

ہرا بھرا پنڈال جل کے خاک ہو گیا ہو ۔۔

شہنائی بج رہی تھی ــــــــــــ،

نغمے گونج رہے تھے ــــــــــ،

ناچ رنگ ــــــــــــ،

چھم چھم چھم ــــــــ ۔۔۔۔ گھنگرو چھنک رہے تھے ۔۔۔۔۔۔

اور ننگو سونا کا ننھا بچہ ہات پھیلا پھیلا کر پیسہ مانگ رہا تھا۔۔۔ــــــ

زنجیر

"جا بے اس کو باغ میں ٹہلا لا، لیکن خیال رکھنا کہیں چھوڑ مت آنا سالے تو ہر وقت ہی ترنگ میں رہتا ہے تجھ کو ذرا بھی اس کی پرواہ نہیں۔" رامو نے ٹامی کی زنجیر ہاتھ میں لی اور چل دیا۔ "چل بیٹا چل پارک میں ٹہل آدیں۔ سالے تیرے مارے صاحب سے کتنی تو گالیاں سننا پڑتی ہیں۔ وہ کتے سے بات کرتا ہوا چلا جا رہا تھا، آج ایک سال تو ہو جائے گا جیٹھ ہی میں تو وہ گھر گیا تھا مگر یہ ٹامی چھوڑے بھی —— سارا دن ان کتوں کے کام میں ختم ہو جاتا ہے۔ ذرا دیر کو چین نہیں ملتی۔ اس کو دودھ پلاؤ اسے بسکٹ کھلاؤ —— اسے ناشتہ کراؤ۔ اے بھگوان ایک ہو تو کوئی بات بھی ہے یہاں تو

صاحب نے نہ جانے کہاں کہاں سے جمع کر ڈالے ہیں۔ اب یہی ہے کتنے دن سے سنتے ہیں مگر نام ہی نہیں یاد ہوتا۔ ہاں ٹامی ـــــ صاحب کہتے ہیں کہ ولایت سے منگوایا ہے۔ جیسے ولایت میں کتے ہی کتے ہوتے ہیں مگر اس پلے نے تو اور مصیبت کر دی ہے ٹھنڈے پانی سے نہلانا۔ ٹھنڈک میں رکھنا ـــــ وہ کتنے آرام سے رکھتا ہے۔ کون ایسی خدمت کرتا ہے مگر تب بھی تو چین نہیں۔ دن رات اسے ڈانٹ پڑتی ہے پلا نہ ہوا مصیبت ہو گیا۔ بھلا اس روز اس نے کیا کیا تھا ذرا کھیلنے لگا تھا۔ آدمی ہی کبھی ہماری طبیعت بھی چاہتی ہے کہ ہنسیں بولیں۔ مگر وہ تو مصیبت ہے چھوٹے بھیانے شکایت کر دی تھی بس پھر کیا تھا ـــــ

"نکال دو سالے کو ـــــ دن بھر تو کتے کو پریشان کرتا ہے۔ جب دیکھو جب مارتا ہے۔ بدمعاش کہیں کا۔ اس طرح کہیں کتوں کو رکھا جاتا ہے کتنے دن سے کام کرتا ہے مگر تجھے کتے کھلانے نہیں آئے ـــــ ابے کتا نہ ہوا سور ہو گیا جو تو اسے مارتا رہتا ہے ـــــ تجھے کتے کھلانے نہیں آتے ـــــ سور کا بچہ ـــــ" اس کی آنکھوں میں تین روز پہلے کے واقعات پھر گئے اتنی ذرا سی بات پر اس کو گھر سے نکالا جا رہا تھا ـــــ بیچ بیچ پندرہ روپیہ اور کھانا بہت ہوتے ہی نہیں تو وہ کب کا چھوڑ دیتا ـــــ بڑی کچی زبان ہے صاحب کی ـــــ دن بھر گالی دیتے ہیں۔ اسکی بھی مصیبت لگی ہے۔ بھلا یہ بھی کوئی بات ہے لیکن مجبوری ہے۔ نوکری کے آگے کسی کا بس نہیں چلتا ـــــ اب اگر اس روز اس کو نکال دیتے

تو وہ کیا کر لیتا ـــــــــ سامنے پارک دکھائی دے رہا تھا "چلو نواب صاحب یہ راستہ ہے۔" راموں نے اس کو کھینچ کر دوسری طرف کر دیا اور اس کو ایک طرف لے کر بیٹھ گیا ـــــ پلّا زبان نکالے کبھی ادھر دوڑتا اور کبھی ادھر ـــــــ معلوم نہیں اس میں اتنی گرمی کہاں سے آگئی ہے۔ دن بھر میں دو مرتبہ تو نہاتا ہے پر یہ گرمی تو کم ہونے کا نام نہیں لیتی اور ہاں آج اسے ڈاکٹر کو بھی تو دکھانا ہے کل صاحب نے کہا تھا خیر یہ بھی تو صاحب کا حکم ہے۔ کوئی ایک گھنٹہ میں مرا تھوڑا ہی جا رہا ہے۔

اس کو کھانسی اٹھی ـــــ کھوک ـــــ کھوک ـــــ کھوک ـــــ سسری یہ کھانسی بھی تو چین سے نہیں بیٹھنے دیتی پیسہ ہو تو علاج کرائے۔ یہ سب کچھ پیسے کا ظہور ہے بغیر پیسہ کے کچھ نہیں ہوتا۔ یہ تو بڑے آدمیوں کی باتیں ہیں۔"

پلّا ایک مرتبہ بھاگا۔ مگر اس نے زنجیر کھینچ لی۔ مانتا نہیں بھیا، چین سے بیٹھ جا راموں اٹھ کھڑا ہوا اور اس کو ٹہلانے لگا ـــــــ وہ خود ٹہل نہیں رہا تھا بلکہ ٹہلا رہا تھا، وہ خود اتنا بڑا آدمی کہاں کہ پارک میں آ کر ٹہلے ـــــ چلو اس نوکری سے یہ تو ہوا کہ اس کو پارک میں ٹہلنے کو تو مل گیا اور اب تو وہ پارک میں بے دھڑک گھومتا ہے۔ ایک روز جب وہ بنچ پر بیٹھا تو کسی نے آ کر پیچھے سے ڈانٹا "ابے یہاں کہاں بیٹھا ہے"۔ لیکن پھر کتے کو۔ دیکھ کر وہ ٹھٹھک گیا تھا پہلے تو راموں سمجھا کہ وہ کتے سے ڈر گیا مگر بڑے آدمی کہیں کتے سے ڈرتے ہیں کیونکہ اس نے پھر فوراً کہا

"اچھا صاحب کے کتے کو لے کر آیا ہے. بیٹھے رہو ____" جیسے کتا اس سے بڑا ہو گیا ____ آدمی ____ اور ____ کتا ____ سچ سچ کتا ہی بڑا ہے۔ دیکھنے میں تو یہی معلوم ہوتا ہے کہ آدمی ہی بڑا ہے پر ہر آدمی نہیں ____ بڑے آدمی کا کتا تو معمولی آدمی سے بڑا ہوتا ہے۔ کتنی عزت ہوتی ہے کتے کے لئے صاحب نے کیسا انتظام کر رکھا ہے۔ اگر کتا نہ ہوتا تو وہ بھی یہاں کہاں ہوتا اس کے لئے صاحب ولایت سے بسکٹ منگواتے ہیں بڑے مزے کے ہوتے ہیں۔ ایک روز تو اس نے بھی کھایا تھا۔ ٹامی کی طبیعت کچھ خراب تھی اس وقت اس نے بسکٹ نہیں کھائے ____ صاحب نے اسے بلا کر کہا "رامو! یہ بسکٹ کھالے"۔

کتے کے بچے بسکٹ۔ اس نے ذرا بھی تو اعتراض نہیں کیا۔ کھٹ سے لے کر کھالیا۔ وہ خود کس "کتے" سے کم تھا۔ کتا ہی اس سے اچھا ہے۔ جو کسی کا بچا ہوا تو نہیں کھاتا۔ ایک روز صاحب نے چھوٹے بھیا کو کتنا ڈانٹا تھا جب انھوں نے ٹامی کو اپنا جھوٹا دیدیا تھا۔ "اس سے بیماری پھیلتی ہے" صاحب کہتے ہیں۔ پر وہ تو بھلا چنگا ہے اس نے تو ہمیشہ ہی جھوٹا کھایا ہے۔ کسی نہ کسی کا جھوٹا تو وہ روز کھاتا ہے

اس کے خیالات کا سلسلہ ٹوٹ گیا۔ سامنے والے کتے کو دیکھ کر ٹامی لپکا۔

"ابے ابھی سے یہ حال ہے۔ ابھی تو پلا ہی ہے" رامو نے زنجیر کھینچی۔ اس نے پارک کے دسوں چکر تو کر ڈالے تھے۔ تھک کر چور ہو گیا تھا۔ اب گھر جانا چاہئے۔ صاحب

بگڑیں گے کہ اتنی دیر کیوں لگا۔

ابھی تو ڈاکٹر کے پاس بھی جانا ہے۔ جیو بھی ایک ہی رہی کئی دن سے اس کی پریشانی بڑھتی جا رہی تھی گھر سے کوئی چٹھی نہیں آئی۔ گھروالی نہ جانے کس حال میں ہوگی، ونڈ یا بھی کچھ پتہ نہیں چلا بھگوان جانے کیا بات ہے رجنی کی مائی چٹھی تو ضرور بھیجتی۔ دو مہینے سے کوئی پتر نہیں آیا۔ ہر دو تیج کو اس کا خط آجاتا تھا اس کی گھبراہٹ سوچنے سے اور بڑھتی جا رہی تھی جب سے وہ تین چٹھی لکھ چکا ہے۔ اب کے چھ پیسے کی چھٹی لکھے گا۔ ای تین پیسے والی نہیں پہنچی۔ خیر اب کے تو وہ چھ پیسے والی ہی لکھے گا۔ چاہے کچھ ہو جائے جواب تو آئے گا۔ صاحب اگر چھٹی دید یتے تو وہ تین دن کے اندر لوٹ آتا۔ پر اب کیا کرے۔ کیسے جائے۔ صاحب کہتے ہیں کہ ٹامی بیمار ہے۔ پھر معلوم ہوتا ہے کہ گرمی بھر نہ جانے دیں گے۔ اس کو بھی تو دنیا اوپر گرمی لگتی ہے کتنا پہاڑ ٹھنڈک نہیں پڑتی۔

اب وہ گھر جائے تو کیسے جائے۔ صاحب بھی کیسے آدمی ہیں۔ دو دن کی چھٹی میں ان کا کیا جاتا ہے۔ دو دن میں تو وہ آہی جائے گا۔ مگر اس کی ہمت بھی تو نہیں پڑتی تھی کہ وہ چھٹی کے لئے صاحب سے کہے کیا فائدہ ڈانٹ پڑے الگ سے۔ کئی رات سے وہ ٹھیک سے سویا بھی نہیں ہمیشہ کیسے کیسے تو خواب دیکھتا ہے۔ رات بھر ڈر لگتا ہے۔ رامو اپنے خیالات میں کھویا ہوا گھر چل دیا۔ سڑک پر کتنی موٹریں تانگے اور یکے جا رہے تھے اور وہ ہر ایک سے کتے کو بچاتا ہوا چلا جا رہا تھا ـــــ

اس کے سامنے زندگی کوئی فلسفہ نہ تھی جو سمجھ میں نہ آسکے۔ اور اس نے اس پہ کبھی غور بھی نہ کیا۔ وہ ایک معمولی نوکر تھا۔ جس کے سامنے زندگی کا مقصد صرف دو وقت روٹی ملنا تھا۔ اور یہی اس کا مطمح نظر تھا جس کی تسکین کے لئے اسے بہت سی صعوبتیں اٹھانی پڑتی تھیں اس کی زندگی کتنی گھناؤنی تھی، جس کو جمالیات سے دور کا بھی واسطہ نہ تھا لیکن یہ ایک بدیہی حقیقت تھی جس کی تردید نہیں ہو سکتی اس کے نزدیک انسان ایک فطری دوریں تھا۔ جہاں سوسائٹی سے دور زندگی گزاری جاتی ہے ہاں کبھی کبھی نوکر کا وجود اس میں ضرور اضافہ کر دیتا تھا، یہاں انسان انسان سے باتیں نہیں کرتا بلکہ جانور سے ہے ——— جس کے پاس زبان ہوتی ہے مگر وہ اپنے درد و غم کو کسی سے کہہ نہیں سکتا بات بھی کرے تو کس سے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جیسے وہ ادھ مرا ہو چکا ہے۔ جس کا اس کو بالکل احساس نہیں کہ وہ کس سے بات کرتا ہے اس کی زندگی کتنی ہم آہنگ ہے ایک جیسی ——— شروع سے آخر تک ویسی ہی ——— مگر وہ گھبراتا نہیں تھا۔ جب وہ اپنے گرد و پیش کا جائزہ لیتا تو ہر ایک ہی اس جیسا ——— اس کے ذمے کتے کی پرورش تھی تو دوسروں کے ذمے پودوں کی دیکھ بھال۔ بس ذرا سا فرق ہے ——— ایک چلتے پھرتے جانور کے ساتھ صبح سے شام کر دیتا ہے ——— تو دوسرا پودوں کے سکون میں دن بھر سورج کی تمازت برداشت کرتا ہے ——— ایک منجمد و بے جان زندگی ——— بالکل مشین ——— جو بجلی کی قوت سے اپنے آپ صبح سے شام تک چلتی ہے

جس کی قوت رفتار میں اس کے ارادے کو دخل نہیں ——— رامو کے ہات میں کتنا تھا اور دماغ پریشان ——— کاش اس کے پاس کوئی ایسا شخص ہوتا جس سے وہ اپنی پریشانیوں کا حال سنا کر اپنا بوجھ ہلکا کر لیتا۔ وہ یہ نہیں چاہتا تھا کہ اس کی پریشانیوں کو دور کرنے والا ہی ہو بلکہ اس کی تو خواہش تھی کہ کاش کوئی اس کی پریشانیاں سن ہی لیتا۔

اس کو اپنی بیوی اور اکلوتی لڑکی سے محبت ہے اور وہ اس وقت ان کے پاس بھی نہیں جا سکتا۔ کتنے دن ہو گئے ان کی خیریت کا کوئی خط بھی نہیں آیا۔ "میری بٹیا"۔

رامو کوٹھی کے اندر جوں ہی پہنچا۔ مالی نے آکر خوشخبری دی۔

"رامو بھیا! آج تمہاری چٹھی آئی ہے"۔ رامو کی خوشی کی کوئی انتہا نہ تھی۔ کتنے دنوں بعد آج اس کے گھر سے چٹھی آئی ہے کاش ڈاکیہ ملتا تو وہ اس کو سلام کرتا۔ اس کو پرنام کرتا ——— اس نے کتنا بڑا احسان کیا ہے۔ مگر وہ اس کا بدلہ تک نہیں دے سکتا تھا۔ ٹامی کی زنجیر اس کے ہاتھوں سے چھوٹی جا رہی تھی۔ وہ اچھل پڑا" کتنے دنوں بعد اس کو ہنسی آئی۔ "نہرا بھیا! دیکھو چہل مت کرو۔ سچ سچ بتا دو کیا چٹھی آئی ہے؟"

"رامو بھیا، پھر وہی بات ——— کبھی تم سے مجاک (مذاق) کیا ہے۔ جواب کریں گے۔ تم بھی کیسی بات کہتے ہو سچ سچ تمہاری چٹھی آئی ہے"۔

"اچھا تو لاؤ"

چھوٹے بھیا کے پاس ہے ڈاکیہ انہیں کو دے گیا ہے۔ مجھ سے پوچھ رہے تھے کہ رامو کہاں ہے۔ میں نے کہہ دیا کہ کتے کو ٹہلانے لے گیا ہے اگر کہو تو بلا لاؤں پر بولے رہنے دو ایسی جلدی نہیں اس کی چٹھی آئی ہے۔

رامو مبہوت سا ہو گیا تھا، مگر وہ خط چھوٹے بھیا کے پاس ہے وہ کمرے کی طرف دوڑا ٹامی کی زنجیر بدستور اس کے ہاتھ میں تھی۔ وہ اس کو باندھنا تک بھول گیا تھا کمرہ خالی تھا۔ یہ وقت تو چھوٹے بھیا کے ناشتہ کرنے کا تھا۔" رامو کو ایک دم یاد آیا۔ وہ وہیں ٹھٹھک کے رہ گیا۔ اب کیا ہو سکتا ہے وہ ناشتہ کر کے دیر سے نکلیں گے۔ اتنی دیر انتظار کرنا پڑے گا۔ معلوم نہیں کیا لکھا ہو پہلے تو یہی لکھا ہو گا کہ دیری کیوں ہوئی۔ بھگوان جانے کیا بات تھی۔ وہ پھر ٹامی کو دوسرے کمرے کی طرف لے گیا شاید یہاں ہوں۔ ابھی کھانا کھانے نہ گئے ہوں، مگر دوسرا کمرہ بھی تو خالی تھا۔ چھوٹے بھیا نے چٹھی کوئی جیب میں تھوڑا ہی رکھی ہو گی۔ ان کی میز پہ ہو گی وہ وہ دوڑتا ہوا میز طرف گیا وہاں ایک چھوڑ پچیسوں چٹھیاں موجود تھیں اب ان میں وہ اپنی چٹھی پہنچاننے تو کیسے پہچانے ـــــ کاش وہ پڑھا لکھا ہوتا لیکن اگر ایسی قسمت ہوتی تو پھر صاحب ہی نہ ہوتا، تمام خطوط اس کے سامنے تھے لیکن وہ خط کو اس میں سے پہچان نہ سکتا تھا۔ کاش وہ تھوڑا بہت ہی جانتا ہوتا ـــ یکایک وہ

پیروں کی آہٹ سے چونک پڑا۔

"کیوں رامو بھیا خط مل گیا ——" نورا نے اس سے دریافت کیا اس کے ہات میں ایک ہنسیا تھی ابھی گھاس کاٹ کر آیا تھا۔ "کیوں بھیا کیا حال ہے۔ سب مجے میں ہیں؟"

رامو کی پریشانی ہر لحظہ بڑھتی ہی جارہی تھی جتنا ہی خط کی خبر سن کر خوش ہوا تھا اتنا ہی اس وقت پریشان تھا۔ نورا کے جواب میں "نہیں" اس کی زبان سے نکلا۔ اس نے یہ خیال بھی نہ کیا کہ نورا وہاں کھڑا ہے۔ رامو نے گھر سے خط نہ آنے کا ذکر اکثر نورا سے کیا تھا اور اسی واسطے وہ جانتا تھا کہ رامو کتنا پریشان ہے۔ کوئی بات ہوگی جبھی تو خط نہیں آیا۔ یہ تو وہ دل ہی دل میں ہمیشہ سوچتا تھا مگر رامو سے ہمیشہ یہی کہا کرتا تھا کہ "بھیا چنتا مت کرو، چھٹی آجائی، ویسے ہی نہ بھیجی ہوگی۔ گاؤں میں کسی کا بیاہ منگنا ہوگا اور اس میں دونوں لگی ہوں گی۔" ہر چند یہ بات بھی مان لینے کے قابل تھی کیونکہ جیٹھ کے مہینے میں تو بہت لگن رکھے جاتے ہیں ——

لیکن یہ دو مہینہ سے بیاہ منگنا ہو رہا تھا، جو انہیں اتنی فرصت نہیں کہ خط ہی لکھ دیں۔ رامو جبھی کھٹکتا تھا کہ جرور کوئی بات ہے۔ نہیں تو رجنی کی ماں اسے خط نہ لکھے۔ اس کے آگے کچھ سمجھ میں نہیں آتا تھا۔

اس وقت نورا بھی رامو سے کچھ کم پریشان نہ تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ جیسے اس کا اپنا معاملہ ہے۔ نورا نے سوچا کہ بچارا کتنا پریشان ہے —— ہونا بھی چاہئے

ان کے مارے ہی تو اتنی مصیبت جھیلتا ہے۔ نہیں تو ایک پیٹ کا کیا۔ راموٹامی کی زنجیر ہاتھ میں لئے کھڑا ہو گیا ــــــــ پرائی تابعداری بھگوان بچائے" نورا نے آہستہ سے کہا کاش وہ اس وقت راموکو مطمئن کر سکتا۔ اس کے دل میں یہ خیال بھی کبھی نہ آیا تھا کہ ہونے دو، اسے کیا واسطہ، آخر ہے تو اپنا ہی بھائی بند ــــــــ مزدور ــــــــ مزدور ــــــــ سب برابر ــــــــ وہ بھی تو ان کی طرح مصیبت میں پھنسا ہے دن بھر کتے کو لئے پھرتا ہے یہ کیا کم مصیبت ہے۔

"کھٹ پٹ ــــــــ "کھٹ پٹ ــــــــ

نورا اور راموچونک پڑے ــــــــ نہ جانے کون ہے جو اتنی تیزی میں آرہا ہے۔ وہاں ہر طرف قبرستان کی سی خاموشی ــــــــ اس کھٹ پٹ نے دوبارہ زندگی دوڑادی جیسے آندھی چلتی ہے تو پتے کھڑکتے ہیں۔ آدمی کے بولنے کی آواز نہیں سنائی دیتی ــــــــ زندگی خاموش رہتی ہے خوف زدہ ــــــــ پتے کھڑکتے ہیں۔ درخت سائیں سائیں کرتے ہیں۔ دھول اڑتی ہے۔

یہ دو مجسمے جو اس کمرے میں سر جھکائے کھڑے ہیں۔ بظاہر مردہ لیکن زندہ ہیں زبان سے کچھ نہیں بولتے لیکن ان کے دلوں میں طوفان آرہے ہیں۔ آنسو کا ایک قطرہ ان کی آنکھوں میں نہیں سخت دل ــــــــ طوفان اور آندھی کا مقابلہ کھڑے کھڑے

کرتے ہیں آخر وقت تک ـــــ "کھٹ پٹ" ـــــ کھٹ پٹ ـــــ یہ بظاہر زندہ ہیں لیکن مردہ ـــــ ان کے دلوں میں کبھی مدوجزر نہیں آتا۔ طوفانی موجیں ان کے ساحل سے نہیں ٹکراتیں کیونکہ ایک معمولی سی ہوا ان کو زیر و زبر کرنے کے لئے کافی ہے۔ نرم دل ـــــ یہ مردہ ہیں زندگی کا کوئی پتہ نہیں ـــــ یہ مردے زندوں پر حکومت کرتے ہیں ـــــ تابکے

"آؤ ـــــ نکل آئیں ـــــ برآمدے میں ـــــ ہم تم وہیں بیٹھیں، صاحب آتے ہیں چھوٹے بھیا بھی آجائیں گے" ـــــ وہ دونوں سر جھکائے ایک طرف چل رہے تھے۔ دو غلام بالکل ایک جیسے ـــــ دو مالک ایک دوسرے کے دشمن ـــــ دو غلام ایک دوسرے کے ہمدم ـــــ ایک عظیم الشان فرق حاکم و محکوم کا ـــــ وہی جو "آج کے انسان" اور "کل کے انسان" میں ہوگا۔

رامو ـــــ اور ـــــ تشا برآمدے میں آکر بیٹھ گئے۔ بالکل خاموش ـــــ وہ دیر تک اسی طرح بیٹھے رہے۔ یکایک ایک مہیب آواز نے ان کو چونکا دیا۔

"ابے تم لوگ یہاں بیٹھے ہو۔ رامو ابھی تک ٹامی کو ڈاکٹر کے پاس نہیں لے کر گیا تجھ سے کتنی مرتبہ کہہ چکا کہ بغیر کہے کام پر چلا جایا کر۔ دیکھتا نہیں اس کی حالت کیسی خراب ہے اگر ایسا ویسا ہوگیا تو میں تجھ کو ٹھیک کر دوں گا۔"

"جاتا ہوں حضور"

جب تک ڈانٹ ڈپٹ کر نہ کہا جائے کوئی کام اپنے مرضی سے تھوڑا ہی ہو گا لات کا آدمی بات سے نہیں مانتا ——— اور ہاں نورا ——— ابے سالے تو یہاں بیٹھا تفریح کر رہا ہے ۔ دیکھتا نہیں گلاب کے سب پودے سوکھ رہے ہیں کل سے پانی نہیں پڑا ———

"ابھی جاتا ہوں سرکار جو ا ———"

کتنی مرتبہ کہہ دیا کہ پانی وقت سے دیا کر ۔ مگر تو اپنی حرکت سے باز نہیں آئیگا معلوم نہیں تیری سمجھ کیسی ہے پودے میں جب پانی نہیں پڑے گا تو وہ زندہ کیسے رہے گا ۔

کون کہتا ہے کہ انسان اشرف المخلوقات ہے ——— جانور ——— اور ——— پودے اشرف المخلوقات ہیں ——— یہ انسان کی خدمت کے لئے نہیں بلکہ انسان ان کی خدمت کے لئے ہے ۔ ارتقار کا یہی اصول ہے ۔ نورا تو اٹھ کر خاموشی سے سامنے والے باغ میں چلا گیا ۔ راموں نے اوپر دیکھا تو صاحب جا چکے تھے ۔ اس نے کتے کی زنجیر کو مضبوطی سے اپنی گرفت میں لیا اور آہستہ آہستہ قدم آگے کو بڑھائے ۔ اسے ڈاکٹر صاحب کے یہاں کتے کو دکھانا ہے ۔ خط آکر ہی دیکھنے کو ملے گا ۔ چھوٹے بھیا ابھی تک نہیں نکلے آخر کیا بات ہے اس نے مڑ کر ایک مرتبہ اور دیکھا اور رک گیا ——— شاید ابھی نکل آئیں

اگر صاحب نکل آئے تو مشکل ہو گی۔ پھر بگڑیں گے، اس نے دوبارہ قدم آگے کو بڑھایا۔ یکایک اس نے ایک آہٹ سنی مڑ کر جو دیکھا تو چھوٹے بھیا رومال سے منہ پونچھتے باہر نکل آئے۔ رامو لپک کر ان کے پاس پہنچ گیا ——— کتے کی زنجیر اس کی گرفت سے چھوٹ ہی تو جاتی۔ اگر کتا اس کے ساتھ نہ دوڑنے لگتا۔

"چھوٹے بھیا! اس نے آہستہ سے کہا۔

رامو رے بے تیرا خط آیا ہے۔" یہ کہہ کر انھوں نے کمرے میں سے ایک پوسٹ کارڈ لا کر اس کے ہاتھ میں دیدیا ——— "جا کسی سے پڑھوا لینا میں کام سے جا رہا ہوں۔"

وہ اپنا خط چھوٹے بھیا سے پڑھوانا بھی تو نہیں چاہتا تھا۔ بات یہ تھی کہ اگر صاحب نکل آتے تو پھر شامت ہی تو آجاتی۔ خط کو ہات میں لیتے ہی وہ تیزی سے لپک کر پھاٹک کی طرف دوڑا۔ مگر پھاٹک سے نکلتے ہی اس کی رفتار میں پھر آہستگی آگئی ——— اب تو صاحب کوٹھی سے باہر بھی نکل آئیں تو کیا دیکھیں گے۔ احاطے میں سڑک کے سامنے کا حصّہ تو پھاٹک سے دکھائی نہیں دیتا۔ وہ خط اس کے ہاتھ میں تھا جس کو وہ بار بار دیکھ رہا تھا۔ کاش وہ پڑھ سکتا اس کے ماں باپ چاہتے تو وہ پڑھا لکھا ہوتا۔ وہ اپنی گھر کی خیریت نہیں پڑھ سکتا اس کی جاہلیت اس کے درمیان حائل تھی۔ کتنی عمر گذر گئی، لیکن آج اس کو افسوس

ہو رہا تھا کہ وہ تھوڑا سا بھی نہیں پڑھ سکتا۔ چند لکیریں کھنچی ہیں، لیکن ان میں سے اس کے گھر کی خیریت ہوگی۔ اس کے پڑھنے کے لئے قابلیت کی ضرورت ہے اسس کو کون پڑھاتا اس کے لئے بھی تو دھن کی ضرورت ہے۔ کون نہیں چاہتا کہ اس کی اولاد پڑھے مگر یہ بھی تو ہے کہ جس کے پاس کھانے کو نہیں وہ کہاں سے پڑھائے اس کا باپ کون ساریئس کا بچہ تھا جو وہ پڑھتا۔ دوبارہ اس نے خط کو دیکھا جیسے وہ پڑھنے کی کوشش کر رہا ہو۔ کچھ نہ کچھ تو سمجھ میں آنا ہی چاہئے اس کو اپنی اس حماقت پر غصہ آیا۔ اور ہنسی بھی۔

سڑک پر کوئی ایسا آدمی بھی نظر نہیں آتا کہ جو صاف کپڑے پہنے ہو اور وہ اپنا خط پڑھوائے۔ اس نے کئی بار ادھر ادھر پوری سڑک کا جائزہ لیا، مگر کوئی ایسا آدمی نظر نہ آیا جس کے کپڑے اس کی علمیت کی شہادت دیتے ہوں ——— وہ سفید کپڑوں کو دیکھ کر آدمی کو پڑھا لکھا سمجھتا تھا ——— اور یہی اس کا معیار تھا جو سو فیصدی پورا اترتا تھا۔ اس نے اب تک جس کسی کو پڑھا لکھا پایا ان میں ہر ایک ہی تو سفید پوش ہوتا۔ غریب آدمی جس کے کپڑوں کی رنگت زمین سے ملتی ہو وہ ہمیشہ سے تو جاہل ہوتے ہیں، ان کے پاس اتنا کہاں جو پڑھیں ——— غربت ——— جہالت ——— ان میں کوئی فرق نہیں ——— ایک ہی چیز کے دو نام ہیں ——— وہ ادھر ادھر دیکھتا ہوا چلا جا رہا تھا، کوئی نظر نہ آیا یکایک اس نے فاصلہ پر ایک آدمی،

کو آتے دیکھا سفید سفید یہ ضرور اس کا خط پڑھ دے گا، اس نے تیزی سے قدم بڑھائے۔ "ابے چلتا کیوں نہیں؟" اس نے شامی کی زنجیر کھینچ کر کہا —— بھگوان جانے اس میں کیا لکھا ہو ابھی ذرا سی دیر میں اسے معلوم ہو جائے گا۔ اس خط کے اندر کیا لکھا ہے۔ رامو گھور گھور کر دیکھ رہا تھا وہ آدمی کافی قریب آ چکا تھا۔ جوں جوں وہ قریب آتا جاتا تھا رامو کے دل کی دھڑکن بڑھتی جاتی تھی حتیٰ کہ وہ اس کے قریب پہنچ گیا تھا۔ وہ رک گیا۔

"سرکار ذرا میری چھٹی تو پڑھ دو، بھگوان تم پر دیا کرے گا۔"

"اچھا لاؤ" —— اس نے ہاتھ بڑھا کر رامو سے خط لے لیا اور پڑھنا شروع کر دیا۔

"دادا کو رجنی کا سلام پہنچے۔

دادا مائی بہت پریشان ہے تمھاری کوئی چھٹی آئی۔ پر وہ کوئی چھٹی نہیں لکھوا سکی۔ میں بیمار ہوں، میری حالت خراب ہے۔ پنڈت جی کو دکھایا تھا کہتے ہیں شہر لے جاؤ نہیں تو بچے گی نہیں۔ ہر وقت بخار رہتا ہے دن بھر کھانسی اٹھتی ہے۔ سب کہتے ہیں بخار کہیں ٹھہر نہ جائے مجھے ڈر معلوم ہوتا ہے۔ بھگوان دیا کرے۔ تم جلدی چلے آؤ اور کہیں سے کچھ روپیہ کا انتظام کر لو۔ میں پریشان

ہوں۔ رجنی اٹھواروں سے بے دانہ بے پانی پڑی رہتی
ہے۔ کتنے دن ہو گئے۔ کچھ کھایا نہیں —— بڑی
دبلی ہو گئی ہے۔ جب آنکھ کھولتی ہے تو دادا دادا
کہتی ہے"

آگے اس سے پڑھا نہیں جا رہا تھا۔ "کسی نیچ کا لکھا معلوم ہوتا ہے"
اس نے دوبارہ کوشش کر کے پڑھا۔

"صاحب سے چھٹی لے کر جلدی آؤ۔ دیکھو تمھیں بٹیا
کا ذرا بھی خیال ہوگا تو تم اس کو دیکھتے ہی فوراً آجاؤ گے
میں دن رات روتی رہتی ہوں، کل پنڈت جی پھر آئے
تھے۔ وہ کہتے تھے تم نہیں آئے تو لونڈیا نہیں بچے گی
بھگوان کے لئے جلدی آؤ۔" رجنی پتہ نام کہتی ہے"۔

"بس یہ لکھا ہے" یہ کہہ کر وہ سکرایا اور اس نے خط کو رامو کے ہات میں دیدیا۔ وہ کانپ رہا تھا۔ وہ کھویا ہوا سا کھڑا تھا۔ وہ آدمی جا بھی چکا تھا خط اس کے ہات سے چھوٹ گیا تھا۔ پھر اس نے خط اٹھایا اور چل دیا۔ جلدی چلنا ہے کہیں ایسا نہ ہو کہ ڈاکٹر صاحب نہ ملیں۔ دیر ہو گئی —— کتا بیمار ہے۔ رجنی بیمار ہے کتے کو وہ ڈاکٹر صاحب کے پاس لے جا رہا تھا۔ اس کی رجنی نہ جانے کیسی ہوگی۔ اس کا علاج کون کرے۔ اس کی رجنی کتے سے بھی گئی گزری ہوگئی، سڑک پر ایک

کتے کو دیکھ کر ٹامی زور سے بھونکا ـــــــ ٹامی بیمار ہے مگر کس زور سے بھونکتا ہے اس نے سوچا کہ اس کی رجنی بول بھی نہیں سکتی ـــ اس کی رجنی کو دق ہو گئی نہیں ـــــ نہیں ویسا ہی بخار ہوگا ـــــ پر اب وہ کیا کرے۔ بخار ہو یا کچھ ـــ اب وہ کہے تو کیا ـــــ صاحب سے کہہ کے دیکھ لوں ، چھٹی دیں گے تو روپیہ نہیں دیں گے اور اگر روپیہ بھی دیا تو پھر چھٹی تو ہرگز نہ دیں گے۔ ابھی مہینہ میں دس دن اور باقی ہیں مگر وہ ڈاکٹر صاحب سے حال تو کہے گا ممکن ہے کہ وہ کچھ دوا دیدیں لیکن صاحب کہتے تھے کہ وہ جانور کے ڈاکٹر ہیں ـــــ لیکن اس کی لڑکی بھی کون جانور سے کم ہے۔ بلکہ کتے کا تو علاج بھی ہوتا ہے۔ صاحب ہزاروں روپیہ اس پر نچھاور کر دیں جو یہ ایسا بیمار ہو اور " میری بٹیا!" ـــــ اس کی زبان سے بیساختہ نکلا۔ غریب کی لڑکی اس کا کون ہوتا ہے۔ وہ ڈاکٹر صاحب سے رجنی کا حال کہہ دے گا کچھ تو جلتے ہی ہوں گے ایسا بھی کیا ـــــ اس کا چہرہ تمتا رہا تھا ـــــ قدم آہستہ آہستہ پڑ رہے تھے ـــــ وہ اپنی بٹیا کا بیاہ کرنے والا تھا۔ بھگوان میرے اوپر دیا کر۔ بھگوان میری بٹیا کو کچھ ہو گیا تو میں زندہ نہیں رہوں گا۔

ڈاکٹر کی دوکان سامنے آگئی۔ ایک بڑا مالا اس کے سامنے آگیا جو ہر لحظہ بڑھتا جا رہا تھا۔ اس نے زنجیر کھینچی۔ کتا بھاگ رہا تھا۔ ساری دنیا زنجیر سے کتے کی طرح جکڑی ہوئی تھی۔ ہر طرف زنجیر ہی زنجیر۔ ہر طرف تالے ہی تالے۔ رامو دوکان کے پاس پہنچ گیا۔ تالے پر اس نے ایک ہاتھ مارا۔ کاش وہ اس کو توڑ سکتا۔ یہ تالے

کتنے مضبوط ہوتے ہیں۔ زنجیریں کتنی سخت ہوتی ہیں۔ زنجیر پکڑے پکڑے اس کا ہات دکھنے لگا تھا۔ اس نے زنجیر دوسرے ہات میں لے لی۔ کیا وہ سیدھا کوٹھی پہ جائے ڈاکٹر صاحب نے نہ جانے کب دوکان بند کر دی۔ وہ خاموشی سے سر جھکا کر چل دیا تھوڑی دور ہی تو ہے دوکان —— اس کے آنے میں بہت تھوڑا وقت لگا ہے۔ پر وہ کیا کرے ڈاکٹر صاحب کی دوکان بند تھی۔ اس کو تو خود اپنی رجنی کے بارے میں پوچھنا تھا۔ لیکن اب وہ کیا کرے، ہائے بھگوان رجنی کا کیا ہوگا۔ اس نے سوچا کہ صاحب سے چھٹی کے لئے ضرور کہے گا۔ صرف تین دن کی —— وہ اپنی لونڈیا کو لے آئے پھر دیکھا جائے گا۔ اس کا علاج کرانا ہے۔ نہ جانے آج اس کی کیا حالت ہوگی۔ تین دن میں تو خط یہاں پہنچتا ہے۔ میری بٹیا بول نہیں سکتی۔ کیسی بیمار ہوگئی۔ "میری رجنی" اس نے آہستہ سے کہا وہ کتے کی زنجیر لئے چلا جا رہا تھا کوٹھی کے اندر داخل ہوگیا۔ صاحب تو ضرور ہوں گے۔ چھٹی کے لئے ان سے آج ہی کہے گا۔

رامو کتے کو لے کر برآمدے میں بیٹھ گیا۔ اندھیرا ہو رہا تھا۔ آج چاندنی رات بھی تو نہ تھی۔ سیاہی بڑھتی جا رہی تھی۔ رامو کتے کے پاس بیٹھا رہا۔ لیکن ایسا محسوس کر رہا تھا کہ جیسے اس کی لڑکی اس کے پاس ہی ہے۔ اگر وہ وقت پر پہنچ جاتا تو ڈاکٹر صاحب اس کی رجنی کے لئے دوا ضرور دیدیتے۔

"رامو" ایک کرخت آواز نے اسے چونکا دیا۔ بجلی کی روشنی نے

اندھیرے کو ختم کر دیا۔

"کیوں بے ہو آیا ڈاکٹر صاحب کے یہاں؟"

"حضور، میں گیا تھا پر دوکان بند تھی۔" "میں جانتا تھا کہ تو دیر کرے گا تجھ جیسا کاہل بھی میں نے نہیں دیکھا۔ کتے کی حالت دن بدن خراب ہوتی جا رہی ہے مگر تجھے فکر نہیں۔ کتنی دیر میں تو اٹھ کر گیا۔ میں عاجز آگیا ہوں ایسے نوکروں سے جن کو ذرا بھی خیال نہیں۔ دیکھتا نہیں ہر وقت زبان نکالے رہتا ہے۔ بھونکتا بھی ہے تو کیسی آواز ہو جاتی ہے۔ نمک حرام کہیں کا۔"

"سرکار میں اسی وقت چلا گیا تھا۔ میں کیا کروں، دوکان بند ہو گئی۔"

"اچھا دور ہو یہاں سے ——— اور ہاں آج تیرے پاس کس کا خط آیا ہے؟"

"سرکار میرے گھر سے چھٹی آئی ہے۔ میری بٹیا بڑی بیمار ہے۔" اس نے خط صاحب کے سامنے پیش کیا۔ انھوں نے خط کو آہستہ آہستہ پڑھا۔ چہرہ کا اتار چڑھاؤ ان کے آنے والے غصہ کی چغلی کھا رہا تھا۔ پڑھتے ہی انھوں نے خط پھینک دیا۔ "بدمعاش گھر سے جھوٹی جھوٹی باتیں لکھوا کر خط منگواتا ہے۔ میں نے تجھ سے منع کر دیا کہ میں چھٹی نہیں دے سکتا۔ اور آیندہ اس قسم کی حرکت دیکھی تو نکال باہر کر دوں گا۔ سور کا بچا۔ بٹیا بھی بیمار ہے اور وہ بھی معمولی نہیں۔ تپ دق ——— جھوٹا مکار ——— دور ہو یہاں سے ——— خط لکھوا کر منگواتا ہے۔ نکل جا، میری کوٹھی سے۔ اب یہاں قدم رکھا تو جوتے مار دوں گا۔ ممی کا یہ حال ہے اور آپ گھومنے جائیں گے

نکل یہاں سے۔ مجھے کوئی ضرورت نہیں ایسے نوکر کی۔ حرامخور کمینہ ــــــ"

رامو خاموش کھڑا زمین کی طرف دیکھ رہا تھا اور کبھی مامی کی طرف ــــ زنجیر اس کے ہاتھ سے چھوٹ گئی وہ یوں ہی دو منٹ کھڑا رہا زنجیر پر اس کی نظریں گڑی ہوئی تھیں لیکن پھر اس نے زنجیر اٹھالی اور اپنے ہاتھوں میں لپیٹ لی۔ وہ نوکری نہیں چھوڑیگا اس بہانہ قرض ہی مل جائے گا ــــــ اس نے زنجیر کو مضبوطی سے پکڑ لیا ــــ بجلی کے بٹن کی آواز آئی ــــ بجلی بجھ گئی تھی ــــ ہر طرف تاریکی ــــــ تاریکی ــــــ آج چاند صبح ہوتے نکلے گا ــــــ

تصویر

سفیل زندگی کو مختلف زاویوں سے دیکھنے کا عادی تھا اور کیوں نہ دیکھتا۔ وہ ایک فنکار تھا جو زندگی کے ہر پہلو پر ایک گہری نظر رکھتا تھا اور شاید یہی وجہ تھی کہ کوئی نقش ایسا نہ تھا جس کو وہ اپنے کاغذی پیرہن کی پیکرِ تصویر نہ بنا سکتا ہو۔ یہ تصویریں کتنی آسانی سے بن جاتی ہیں، وہ خوش ہوتا تھا۔ اس کے خریدار کتنے بھولے ہوتے ہیں۔ اس کی ہر بنائی ہوئی تصویر منہ مانگی قیمت پر لے لیتے ہیں بالخصوص عورتوں کی تصویریں ——— بالخصوص کیوں، اس نے اپنی بنائی ہوئی تصویروں کا دل ہی دل میں جائزہ لینا شروع کر دیا ——— اس نے اب تک عورتوں ہی کی

تصویریں تو بنائی تھیں ____ خوبصورت لڑکیوں کی تصویریں ____ کتنی اچھی تھی وہ رادھا کی تصویر ____ نیلی ____ نیلی ____ اس کی نظر خود بخود اوپر کو اٹھ گئی ____ آسمانی رنگ اس کو کتنا پسند تھا۔ جتنا گہرا ہو اتنا ہی اچھا ہے۔ رنگوں میں اس سے بہتر رنگ کوئی بھی تو اس کی نظر میں نہ تھا ____ اس کی تقریباً تمام تصویروں میں یہ رنگ کہیں نہ کہیں ضرور ہوتا اگر چہرے پر جامن کا عکس نہ پڑتا تو ساری تو ضرور اس رنگ میں رنگی ہوتی۔ اسے اکثر نوجوان لڑکیوں پر غصہ آتا۔

پھولچند بزاز کی دوکان پر وہ لڑکی کتنی خوبصورت تھی۔ اسے دیکھنے ہی کے لئے تو وہ اس کی دوکان پر چلا گیا تھا، کپڑا تو لینا تھا نہیں لیکن دیکھنا یہ تھا کہ کون سی ساری پسند کرتی ہے۔ ساریوں کا انبار لگا ہوا تھا، کتنی اچھی تھی وہ نیلی ساری، کاش اس کے پاس اتنے روپیہ ہوتے تو وہ اس کو ضرور خرید لیتا۔ مگر کس کے لئے وہ اپنے اوپر ہنسا وہ ایسا محسوس کرنے لگا کہ جیسے وہ لڑکی اس نیلی ساڑی کو اٹھا ہی دے گی۔ مگر بھگوان جانے یہ لڑکیاں رنگوں کے معاملہ میں کتنی ناسمجھ ہوتی ہیں۔ اس نے اس کو تو ایک طرف رکھ دیا۔ "کتنا گہرا رنگ ہے اس کا لالہ جی یہ بھی کوئی رنگ ہے"۔ اور یہ کہہ کر اس نے زرد رنگ کی ایک ساری اٹھالی۔ سنیل کو غصہ تو بہت آیا۔ ہتک کرتی ہے نیلے رنگ کی کرشن بھگوان کا یہ رنگ ہے۔ ۔ ۔ ۔

۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ رادھا کے گال اسی میں رنگے تھے

بڑی آئی ہے۔" وہ وہاں سے ہٹ کر چل دیا۔ لیکن لڑکی اچھی تھی پر کیا کرے وہ اس اچھی لڑکی کو جس کو اتنی تمیز نہیں کہ کون سا رنگ اچھا ہوتا ہے۔ اور پھر آپ کو پسند نہیں تو نہ لیجئے۔ یہ کون سی بات ہے کہ کتنا گہرا رنگ ہے

جیسے آپ کا رنگ بڑا ہلکا ہے اس کا غصہ بڑھتا جا رہا تھا۔ ہاں کرشن بھگوان کی جو تصویر اس نے بنائی تھی وہ بڑی اچھی بنی تھی جب وہ بانسری بجا رہے تھے۔ وہ تصویر اس کا شاہکار تھی۔ اٹلی کے فنکاروں کی تصویریں اس نے بہت دیکھی تھی بالخصوص حضرت عیسیٰ کی صلیب والی تصویر اور مریم کی تصویر جس کے نیچے "میڈونا" لکھا تھا۔ اچھی تو تھی وہ تصویر بھی لیکن اس کی بنائی ہوئی کرشن بھگوان کی تصویر ——

وہ اپنی پنسل سے چند لکیریں کھینچتا ہے لیکن وہ اس کے دل سے نکلتی ہیں اور اس کے بعد وہ تصویر کی روح تک پہنچ جاتا تھا۔ کرشن کی تصویر جب وہ بنا رہا تھا تو اس وقت اس کے کانوں میں بانسری کی لے گونج رہی تھی۔ بانسری کی لکڑی سے —— کتنی اچھی آواز نکلتی ہے۔ اس کی تصویریں اس سے باتیں کرتی ہیں اور یہی وجہ تھی کہ وہ گھٹنوں میں سر گڑھوئے بیٹھا رہتا تھا۔ اس نے کتنی تصویریں بنا ڈالیں، پندرہ برس ہو گئے اس کو کام کرتے ہوئے۔ پانچ سال میں اس نے ہندوستان میں کتنی شہرت حاصل کر لی ہے۔ اس وقت وہ محسوس کر رہا تھا کہ وہ کتنا بڑا آدمی ہے اتنے دن ہو گئے۔ اس نے کبھی یہ نہیں سوچا کہ اس کی کتنی عزت ہوتی ہے۔ ہندوستان اس کی تصویروں کو کتنا پسند کرتا ہے۔ پچھلے مہینوں السٹریٹڈ ویکلی میں اس کی تصویر

چھپی تھی ـــــ وہ دوڑتا ہوا کمرے میں گیا۔ فوراً السٹریٹیڈ ویکلی اٹھا کر اس نے وہ تصویر دیکھی۔ اس کی اپنی تصویر۔ کتنی تعریف اس نے لکھی تھی۔ وہ الفاظ اس کو اٹھے ہوئے دکھائی دیئے۔

"مسٹر سنیل ہندوستان کے مشہور آرٹسٹ جن کی ایک
تصویر بمبئی کی نمائش میں بہترین فن کاری کا نمونہ مانی
گئی ہے۔ یہ صدی کے بہترین آرٹسٹ ہیں۔ اس
نمائش میں چینی فن کاروں کی تصویریں بھی موجود تھیں
لیکن مسٹر سنیل کی تصویر ان سب میں بہتر مانی گئی ہے
ـــــ آج ہندوستان ان پر فخر کرتا ہے۔"

اس نے ان چند جملوں کو کئی مرتبہ پڑھا۔ ہے کوئی قدردان۔ کاشش وہ اس کے ایڈیٹر سے مل سکتا۔ لیکن پھر وہ آزردہ کیوں ہو گیا۔ وہ تصویر اچھی تو تھی۔ اس لڑکی کو اس نے نہاتے ہوئے دیکھا تھا۔

کاشش وہ لڑکی اس تصویر کو دیکھ سکتی۔ معلوم نہیں کون تھی وہ۔ کہاں ہو گی مگر اس میں پھر فرق بھی تو تھا وہ لڑکی غریب تھی اور میری تصویر۔ اس کو اپنے اوپر غصہ آنے لگا۔ ہاں یہ اس کی غلطی ہے۔ لیکن اس نے یہ غلطی تو ہر تصویر میں کی ہے۔ ہندوستانی لڑکی جو ڈولی لیکھ کنوئیں پر جاتی ہو۔ اس کی ساری۔ نیلی ساری اوڑھنی۔ اس نے اپنی گردن کو ایک جھٹکا دیا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ جیسے وہ اپنے

ماضی کو بھول جانا چاہتا تھا لیکن نیلا رنگ، نیلی ساری اس کے دماغ پر چھائی ہوئی تھی۔ وہ رنگ جس کو وہ ابھی تھوڑی دیر پہلے بہترین سمجھتا تھا۔ جس کے خیال سے وہ خوش ہوتا تھا، اس وقت وہ اس کو روحانی تکلیف پہنچا رہا تھا وہ گھبرا رہا تھا جیسے کوئی چٹکی میں لیکر اس کے دل کو مسل رہا ہو۔ "فن برائے فن"، اس پر کتنی مرتبہ وہ انجم سے بحث کر چکا تھا۔ آج انجم ــــ کے جملے جیسے اس کے کانوں میں اپنے آپ گھس رہے تھے۔ فن کو زندگی سے کوئی واسطہ نہیں"۔ وہ زور شور سے کہا کرتا تھا۔ "فن تو انسانی ذہن کو مطمئن کرنے کے لئے ہوتا ہے۔ روحانی مسرت بہم پہنچانے کے لئے دنیاوی پریشانیوں سے اس کو کیا واسطہ ــ چاہے دنیا مر جائے۔ چاہے کوئی کسی پر کتنا ہی ظلم کیوں نہ کرے۔ لیکن آرٹسٹ کو اس سے کوئی واسطہ نہیں، ورنہ پھر فنکار اور سیاستدان میں کیا فرق رہ جائے گا"۔ انجم سے وہ یہی کہا کرتا تھا، لیکن ایسا معلوم ہوتا کہ جیسے آج وہ الفاظ بے جان ہو گئے ہیں۔ آج اس کا ساتھ چھوڑ رہے ہیں۔ افلاس، بھوک ــــــ لیکن اس کا دل ان کو قبول نہیں کرتا۔ نیلا رنگ، نیلی ساری، خوبصورت دوشیزہ، جس کے گال پھولے پھولے کالی کالی آنکھیں، بڑے بڑے بال ــــــ لیکن اس کا دماغ ان سے کیوں گھبرا رہا ہے۔ وہ پریشان تھا۔ دنیا کے ابا حتوں کو بھول جانا چاہتا تھا۔ فن، فن کے لئے۔ فن زندگی کے لئے۔ وہ فیصلہ نہیں کر سکا۔ اس کو اپنے اوپر تعجب ہو رہا تھا۔ ابھی پچھلے ہفتہ اس نے فن پر کتنی اچھی تقریر کی تھی۔ وہ ریڈیو پر

اس کی چوتھی تقریر تھی۔ کتنے مزے میں اس نے ثبوت دیا تھا کہ فن کو دنیاوی حیثیتوں سے کوئی تعلق نہیں۔ اور آج ہندوستان کا سب سے بڑا آرٹسٹ اپنے فن سے خود ہی مطمئن نہیں تھا۔ اس کو اپنے فلسفیانہ دماغ پر غصہ آنے لگا۔ جو ہر بات میں مین میخ نکالتا ہے لیکن ہے تو ٹھیک۔ اس وقت اگر اس کے سامنے نیلی ساری ہوتی تو شاید وہ اس کو پھاڑ ڈالتا۔ آج اس کو محسوس ہو رہا تھا کہ ابھی تک اس کا فن مکمل نہیں۔ اس نے کوئی تصویر اس کے حقیقی رنگ میں پیش نہیں کی۔ پھر اس کے خریدار اس کی بنائی ہوئی تصویریں کیوں اتنی پسند کرتے ہیں۔ وہ جتنا سوچتا تھا۔ اس کی الجھن بڑھ رہی تھی ——— اس کی تصویریں ——— نیلی نیلی ساریاں، حقیقت سے کتنی دور ہے اس کا آرٹ ——— جیسے پیتل پر ملمع چڑھا دیا ہو۔ اس عرصہ میں اس نے لاتعداد مضامین آرٹ سے متعلق پڑھے۔ فن برائے فن، فن برائے زندگی، وہ کوئی فیصلہ نہ کر سکا، آخر وہ مطمئن کیوں نہیں ہوتا، اس کا فن بھی تو کوئی معمولی چیز نہیں ——— کتنا خوبصورت ہے یہ نیلا رنگ نیلی نیلی آنکھیں۔ جاپانی عکس ——— وہ عرصہ تک اسی بھول بھلیاں میں کھویا رہا۔

سنیل نے اپنی رنگ کی پیالیوں کی طرف دیکھا۔ "رنگ خشک ہو گئے۔" وہ بولا۔ وہ آیا بھی تو کتنے دن بعد ہے۔ ہفتوں ادھر ادھر گھوما، ایک ہفتہ

کے قریب وہ تو بنگال ہی میں رہا۔ اس کی آنکھوں کے سامنے بنگالی عورتوں کے ڈھانچے ناچنے لگے۔ اس نے دو سال ہوئے ایک بنگالی دوشیزہ کی بھی تو تصویر بنائی تھی۔ کتنی خوبصورت تھی وہ تصویر، لانبے لانبے بال، گورے گورے بھرے ہوئے بازو، گلابی گال۔ اور نیلی ساری پہنے ہوئے۔ اس کی آنکھوں کے سامنے ہزاروں ایسی ہی تصویریں گھومنے لگیں۔ بنگالی دوشیزہ ——

وہ دیر تک سوچتا رہا —— میں نے کتنی عورتیں دیکھیں پر ان میں کوئی بھی تو میری بنائی ہوئی تصویر سے نہیں ملتی —— نہ ایسی رنگت نہ نیلی ساری —— نیلی ساری کا خیال آتے ہی اس کی آنکھوں کے سامنے ایک بنگالی دوشیزہ کی تصویر پھر گئی۔ کتنی بھوکی تھی وہ لڑکی۔ اس کا جسم بالکل ننگا تھا۔ پھٹے ہوئے چیتھڑے پہنے تھی۔ اس کی ساری کتنی میلی تھی —— اور اس کی نظروں کے سامنے اس کی اپنی بنائی ہوئی تصویروں کی نیلی نیلی ساریاں چھا گئیں۔

اس کا فن زندگی سے کتنی دور رہا —— اس نے گردن کو جھٹکا دیا —— فن زندگی کے لئے ہے۔ اس کو کوئی بھی زندگی سے الگ نہیں کر سکتا۔ تصویر حیات انسانی کا نقش ہے۔ میں نے اپنی تصویریں کتنی محنت سے بنائی تھیں۔ وہ پانی بھرنے والی دوشیزہ کی تصویر جس کو میں نے مہینوں کی محنت کے بعد بنایا تھا۔ کتنی خوبصورت تھی وہ تصویر —— لیکن زندگی —— وہ پریشان ہو گیا۔ آج فن کار اپنے فن کا خود ہی ناقد تھا۔ اگر آج اس کے سامنے وہ تصویر

ہوتیں تو شاید ان کو پھاڑ کر ٹکڑے ٹکڑے کر دیتا۔ اس نے کیسی محنت سے وہ تصویریں بنائی تھیں۔ مگر اس وقت وہ ان سے بیزار ہو رہا تھا۔ اسکی آنکھوں کے سامنے تو بار بار آنکھوں کے سامنے تو بار بار وہی بھوکے بچے، بھوکی عورتیں گھوم رہے تھے۔ بنگالی دوشیزہ ایک مٹھی چاول کے لئے جانوروں کی طرح بیچی جائے ——— بھگوان بنگال کی جوان لڑکیوں کی آبرو کی قیمت ایک مٹھی چاول ———

اندھیرا ہو چلا تھا۔ سنیل نے اٹھ کر چراغ جلایا اور اپنے قریب ہی رکھ لیا۔ اس کی لو کانپ رہی تھی۔ سنیل نظریں گاڑے اس لو کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اور اس کی کانپتی ہوئی لو میں ہزاروں تصویریں ناچنے لگیں۔ وہ کتنی ہی دیر تک دیکھتا رہا رفتہ رفتہ چراغ کی لو غائب ہو گئی، اس کے سامنے وہ بنگالی دوشیزہ آکھڑی ہوئی۔ پیلے پیلے پچکے ہوئے گال۔ سوکھی ہوئی بے نور آنکھیں ———

اس کا قلم آہستہ آہستہ کاغذ پر چلنے لگا۔ وہ زندگی سے آج کتنا قریب ہو چکا تھا وہ سوچنے لگا۔ یہ تصویر میرا شاہکار ہو گی۔ وہ اپنے فن کو اس تصویر پر ختم کر دے گا اور اس کے بعد پھر شاید کوئی تصویر نہ بنائے گا، اس کا قلم چل رہا تھا اور وہ دوشیزہ اس کے سامنے کھڑی تھی۔ نیم برہنہ زندہ، لیکن عنقریب موت سے ہمکنار ہونے والی۔ مگر ہے تو ہماری سماج کی پستی کا ایک عکس ——— چراغ کی لو کانپ رہی تھی۔ اور اس کپکپاہٹ میں سنیل کا دماغ دھندلے دھندلے خاکے پیش کر رہا تھا۔ اور اس کا قلم کاغذ پر رینگ رہا تھا۔

سنیل نے ایک نظر باہر کی طرف دوڑائی ۔ بڑا اندھیرا ہو گیا۔ اسے دوکان سے روٹی بھی تو لانی ہے۔ اس نے چراغ کو وہیں رکھا رہنے دیا۔ قلم اور تصویر کو بھی وہیں چھوڑا۔ اور دروازہ بند کر کے روٹی کی دوکان کی طرف چل پڑا۔

راستہ بھر تصویر اس کی آنکھوں کے سامنے ناچتی رہی ، جسم کا رنگ ، چہرے کا رنگ ، آنکھوں کا رنگ ، کالے کالے بال گرد میں اٹے ہوئے چہرے کی رنگت پیلی پیلی ، سوکھے سوکھے ہات ، پتلی پتلی انگلیاں ، سوکھا ہوا کھانکر جیسا سینہ ، سوکھی ہوئی گردن جیسے موت اپنے مضبوط ہاتوں سے اسے مروڑ رہی ہو ۔

"کیا چاہئے ؟"

یہ آواز روٹی بیچنے والی لڑکی کی تھی ۔ سنیل چونک پڑا۔ روٹی کی دوکان آگئی تھی ۔

"روٹی چاہئے ۔

سنیل نے اس طرح کہا جیسے کوئی خواب میں بڑبڑا رہا ہو ۔

"روٹی ؟"

"ہاں"۔

"لڑکی نے گرم گرم روٹیاں نکالیں"۔

"نہیں ــــــــــ سنیل جلدی سے بولا ۔ " باسی روٹی چاہئے"۔

لڑکی نے اس کی طرف دیکھا۔ اس نے اکثر اس شخص کو ادھر سے جاتے ہوئے دیکھا تھا۔ یہ کوئی تصویر بنانے والا ہے اس نے دل ہی دل میں کہا اور اس کے ہاتوں کی طرف دیکھنے لگی۔ اس آدمی کے ہات اور کپڑوں پہ ہمیشہ رنگ کے دھبے لگے رہتے ہیں۔

"کتنی روٹی چاہئے؟"

لڑکی نے پوچھا

"صرف چار ——— ذرا جلدی دیدو۔"

یہ لڑکی بھی کتنی تیز ہے بغیر انتظار کرائے تو کبھی کسی کو روٹی دیتی ہی نہیں۔ سنیل دل ہی دل میں کہنے لگا۔ وہ تھی بھی بڑی تیز اور اس وقت سنیل سے تو نہ جانے کیوں وہ دلچسپی لے رہی تھی، وہ سوچتے سوچتے پھر بھول گئی کہ اس کو روٹی دینی ہے۔

"باسی روٹی نہیں ہے؟"

سنیل نے پھر پوچھا

"ہاں روٹی ——— میں بھول گئی تھی، تم کو روٹی چاہئے۔

وہ جلدی جلدی روٹی نکالنے لگی!

سنیل جھنجھلا گیا، مگر کہتا تو کیا، خاموشی سے روٹی لی اور چل پڑا۔ وہ لڑکی اسے دیکھتی رہی جب تک وہ نظر آیا۔ اس کی دوکان پہ روٹی خریدنے تو بہت

سے لوگ آتے ہیں، مگر وہ خاموشی سے انھیں دیدیتی ہے۔ آج معلوم نہیں اس نے اس خریدار کو کیوں اتنی دیر کھڑا رکھا۔ "وہ کیا سوچتا ہوگا"

"کیا سوچتا ہوگا!" یہی جملہ دیر تک وہ دہراتی رہی، مگر یہ نہ سوچ سکی کہ وہ کیا سوچتا ہوگا۔ اسے غصہ آیا ہوگا۔ شاید اب وہ روٹی اس کی دوکان سے خریدنے نہ آئے ــــــ باسی روٹی ــــــ یہ باسی روٹی کیوں لے گیا ہے؟ بچارے کے پاس پیسہ تھوڑے ہی ہوں گے۔ گرانی بھی تو کیسی ہو رہی ہے مگر میں اسے تازی روٹی دیدیتی ــــــ کتنا غریب معلوم ہوتا ہے بچارا پر ہے کوئی تصویر بنانے والا۔ انگلیوں میں بھی رنگ لگا تھا معلوم نہیں کیسی کیسی تصویریں بناتا ہوگا۔ رنگ برنگی تصویریں اسے دکھائی دینے لگیں۔ اور اسے اپنی تصویر جو اس کی کوٹھری میں لگی ہوئی تھی، یاد آگئی۔ وہ دوڑی ہوئی اندر گئی اور تصویر اٹھا لائی، کتنی خوبصورت ہے یہ تصویر، پر اس کا بنانے والا بھی تو کتنا مشہور ہے۔

"سنیل" ــــــ اس نے آہستہ آہستہ اس نام کو کئی بار دہرایا۔ اس کی نظریں تصویر پر اس طرح گڑی ہوئی تھیں جیسے وہ اپنی روح تک کو اس تصویر میں جذب کر لے گی۔ وہ اس تصویر بنانے والے کو دیکھ سکتی۔ کاش وہ جانتا کہ اس تصویر کو وہ کتنا عزیز رکھتی ہے اسے یہ تصویر کتنی پسند ہے۔ کیسا اچھا ہو اگر اس کا بنانے والا ــــــ اس نے تصویر کو دکان میں سامنے والی

دیوار پر لٹکا دیا۔ لیکن اس نے یہ تصویر یہاں کیوں لٹکا دی۔ یوں ہی آخر اندر بھی رکھے رکھے کیا ہوتی۔ پڑی خراب ہو رہی تھی۔ معلوم نہیں کتنی قیمتی ہوگی اسے تو یہ مفت ہی مل گئی تھی اس نے ساری کے آنچل سے اس کو جھاڑنا شروع کر دیا۔ اس پہ کتنی مٹی جمی ہوئی ہے۔ اُف وہ —— کتنے سال ہو گئے خراب ہو جاتی اگر نہ دیکھتی۔ اس نے سوچا کہ اس کو پھر اندر رکھ آئے۔ آخر یہاں بھی رکھنے سے کیا فائدہ —— رہنے بھی دو، وہ کسی کا کیا [illegible]ڑتی ہے۔ پھر دوکان بھی کتنی سجی ہوئی معلوم ہوتی ہے۔ جیسے کوئی بڑا ہوٹل ہو۔

وہ دل ہی دل میں ہنسی۔ وہ اس وقت بہت خوش تھی۔ لیکن اس کو پھر اس سے فائدہ ہی کیا۔

ہوں —— کتنی دیر ہو گئی وہ فیصلہ نہیں کر سکی کہ آیا اس کو یہیں لٹکا رہنے دے یا اتار کر اس کی پرانی جگہ پہ رکھ آئے۔ اس تصویر کی نیلی ساری اس کی آنکھوں میں کھبی جا رہی تھی اور اس پہ یہ تارے اس سے تو اور بھی اچھی معلوم ہوتی ہے۔ نیلا رنگ —— آج گویا پہلی بار اس کی ساری کو غور سے دیکھا تھا۔ کتنا اچھا رنگ ہے —— معلوم نہیں کس کی تصویر ہوگی۔ بھگوان جانے ایسی لڑکیاں کہیں ہوتی بھی ہیں یا نہیں۔

ہوگی کیوں نہیں۔ ہاں کسی بڑے گھر کی معلوم ہوتی ہے۔ ہے تو بڑی سندر

اس کی آنکھوں میں کیسی چمک ہے پر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جیسے کچھ اداس ہے۔ آخر یہ اداس کیوں ہے اتنے بڑے گھرانے کی لڑکی اور ایسی اداس۔ پر اداس ہوتی تو پھر ایسے بڑھیا کپڑے ہی کیوں پہنتی، پان کیوں کھاتی، بال کیوں بناتی! اس کو ہنسی سی آئی۔ وہ اتنی اچھی تصویر کی خرابی بتا رہی ہے۔ دادا کہتے تھے کہ یہ ہمارے دیش کے ایک بڑے اچھے تصویر بنانے والے نے بنائی ہے۔ سنیل ہی تو لکھا ہے اس پر ——————

اس نے غور سے دیکھنا شروع کر دیا۔ وہ بھی کتنی ناسمجھ ہے۔ اتنے بڑے آدمی کی تصویر کی برائی کرتی ہے —— ہاں تو پھر اس کو یوں ہی رہنے دو۔ کل شام تک تو لگی رہنے دو۔ پھر اتار دوں گی جب وہ آئے گا۔ ہوں آئے گا تو کیا۔ یہ تصویر اب یہیں لگی رہے گی۔ اس کو اپنے اوپر غصہ آیا اور کچھ ہنسی بھی کہ وہ اپنے آپ کو دھوکا دے رہی ہے۔ وہ جانتی تھی اور پھر بھی یہ سوال اس کے دماغ میں بار بار آ رہا تھا کہ یہ تصویر اس نے کیوں لگائی ہے۔ آخر اتنے دن بعد کیوں یاد آئی۔ پہلے ہی کیوں نہ لائی تھی۔ بڑی شوقین بنتی ہے۔ وہ اس وقت اپنا احتساب خود کر رہی تھی۔۔۔۔۔۔۔۔

۔۔۔۔۔۔۔۔۔ یہ بھی کوئی تصویر بنانے والا ہے۔ انگلیوں میں رنگ، کپڑوں پر رنگ برنگے دھبے پڑے ہوئے۔ ہوگا کوئی۔۔۔۔۔۔۔۔۔

۔۔۔۔۔۔۔ میری جیسی تصویر تو کیا بنائے گا۔ وہ اس وقت فخر محسوس کر رہی تھی کہ اس کے پاس سنیل کی تصویر ہے۔۔۔۔۔۔۔۔۔ سنیل کی بنائی ہوئی تصویر۔ اور یہ ہوں گے کوئی ایسے ہی اناڑی۔ ابھی تو رنگوں کے نشان لگے تھے۔ ابھی

ابھی سیکھی ہوگی بنانی۔ پر ہے کوئی غریب دکھیا جو باسی روٹی لے گیا ہے۔ باسی ٹکڑے، بچارے کے پاس اتنا بھی نہیں کہ وہ تازی روٹی کھائے۔ وہ اس کی قسمت پر افسوس کرنے لگی۔ سچ مچ دادا ٹھیک کہتے تھے کہ ہمارے دیس میں ایسی چیزوں کی قدر نہیں ہوتی۔ دیکھو ویسے تو معلوم نہیں کیسی کیسی تصویریں بناتا ہوگا۔ پر غریب ہے کھانے کو نہیں۔ دن بھر کام کرتا ہے اور شام کو باسی روٹی کھاتا ہے۔

دوکان کے باہر کتوں کے لڑنے سے وہ چونک پڑی۔ ہوں، وہ بھی کیسی کیسی باتیں سوچتی ہے ہوگا کوئی اس سے کیا مطلب۔ ایسے تو اس کی دوکان پر نہ جانے کتنے آتے ہوں گے وہ اسی بھرکی ہوگئی کہ ہر ایک کی غریبی پر افسوس کرے۔ ہمارے دیش میں تو سب ہی ایسے ہیں۔ اس کی نظر کتوں پر جمی ہوئی تھی جو آپس میں لڑ رہے تھے —— ایک روٹی کے لئے دونوں ایک دوسرے کو کھانے کو دوڑ رہے تھے۔ یہ نہیں آدھی آدھی کھالیں یہ کتے بھی بالکل ناسمجھ ہوتے ہیں اتنا نہیں سمجھتے کہ لڑنے سے چوٹ لگے گی اور روٹی الگ خراب ہو رہی ہے۔

کتوں کی لڑائی بڑھتی جا رہی تھی وہ غرا غرا کر ایک دوسرے پر دوڑ رہے تھے ایک دم سے وہ روٹی سامنے والے پت نالے میں ایک کتے کے منہ سے چھوٹ کر گر گئی۔ پانی کا بہاؤ تیز تھا بہا لے گیا۔ روٹی جا چکی تھی، پر کتے ابھی تک لڑ رہے تھے۔

اس نے اپنی نظر ان کتوں سے ہٹالی اور خوب زوروں سے ہنسی۔ اب اس کو

ان کتوں پر پھر غصہ آیا۔ دیکھو اس سے اناج کتنا مہنگا ہو رہا ہے اور انھوں نے ایک روٹی خراب کر دی۔ اس نے دوبارہ اپنی نظر اس تصویر پر گاڑ دی۔ لگی رہنے دو دیکھا جائے گا۔ وہ وہاں سے ہٹ گئی ——— اچھا دیکھیں وہ کیا کہتا ہے۔ پوچھوں گی کہ یہ تصویر کیسی ہے۔ آنے دو۔ اس سے یہ تو ضرور ہی پوچھوں گی کہ وہ کیا کام کرتا ہے باسی روٹی کیوں کھاتا ہے؟ ہوں ——— یہ بھی کوئی پوچھنے کی بات ہے۔ غریب آدمی ہوگا جبھی تو باسی روٹی لے جاتا ہے۔

شام ہو چکی تھی، سنیل نے چراغ جلایا، اور پھر اپنی تصویر لے کے بیٹھ گیا۔ وہ تمام دن اسی تصویر میں لگا رہا اور اب اس کو رنگنا ہی باقی تھا وہ چھوٹی چھوٹی کٹوریوں میں رنگ گھول رہا تھا۔ پیلا پیلا رنگ، سیاہ رنگ، نیلا رنگ ——— اوہوں ——— ساری کا رنگ نیلا نہیں ہو سکتا، وہ اپنے اوپر ہنسا۔ "بیوقوف یہ بھوکی عورت کی تصویر ہے۔ اس کی ساری کیسی نیلی ہو سکتی ہے" وہ اس نے نیلے رنگ کے پیالی کو الگ اٹھا کر رکھ دیا۔ کاہی کاہی سا رنگ ——— ہاں یہ ٹھیک ہوگا۔ پھٹی ہوئی ساری کس رنگ کی ہو سکتی ہے۔ میلا میلا سا رنگ ہونا چاہئے۔ پھٹی ہوئی ساری بس ٹھیک ہے۔ وہ اسی رنگ سے رنگے گا۔ اور وہ اسے گھولنے لگا۔ وہ ہر چیز میں نیلا ہی رنگ لگانے لگتا ہے ——— ہوں اسے نیلے رنگ سے نفرت سی ہونے لگی۔ وہ کبھی تصویر کی طرف دیکھتا اور کبھی اپنے بنائے ہوئے رنگوں کی طرف۔ کتنی اچھی تصویر بنی ہے۔ وہ دل ہی دل میں خوش ہو رہا تھا۔ اور جب یہ تصویر مکمل

ہو جائے گی تو اس کا شاہکار ہوگی ۔ ایسی تصویر اس نے آج تک نہیں بنائی تھی ۔ کل وہ اپنی تصویر مکمل کرے گا ۔

اس نے اس سے پہلے بھی ایک بنگالی دوشیزہ کی تصویر بنائی تھی اور اسے اپنی اس تصویر پہ ناز تھا .... کتنی خوبصورت تھی وہ تصویر اور اس کی قیمت بھی اسے منہ مانگی مل گئی تھی ـــــــ اس وقت اس کے جذبات کو ٹھیس سی لگی ۔ وہ اس تصویر کے متعلق سوچنا نہیں چاہتا تھا ۔ وہ ایک خوبصورت لڑکی کی تصویر تھی ـــــــ اور یہ تصویر ایک بھوکی عورت کی تصویر ہے ۔ اس کی میلی کچیلی ساری ـــــ سے ہمارے سماج کی کمزوریاں جھلکتی ہیں ۔ وہ اس تصویر میں پورے بنگال کی روح کھینچ کر بھر دے گا ، اس کی پھٹی پھٹی بے نور آنکھوں میں مایوسی، لاچاری اور آنے والی زندگی کی دہشت ہے ہر چند اس کی تصویر موت کا عکس ہے لیکن ہے تو زندگی کا بھیانک سین ، اس کا برش تصویر پہ فراٹے بھر رہا تھا اور وہ سوچتا چلا جا رہا تھا جیسے وہ سماج کا رخ موڑ رہا ہو ۔ وہ اپنی قوم کی تباہی دکھا رہا تھا ۔

آج پہلی بار اسے اطمینان محسوس ہو رہا تھا ۔ اس نے کتنی تصویریں بنائیں پر وہ کبھی مطمئن نہ ہو سکا ۔ اس نے ہات روکا اور بڑے غور سے اپنی تصویر دیکھنے لگا ۔ وہ تصویر کا کچھ حصہ رنگ چکا تھا ۔ پر ابھی تو بہت باقی ہے ۔ اس کا برش پھر چلنے لگا ۔ آج اسے اپنا فن مکمل نظر آرہا تھا ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ جیسے

اس کا برش سماج کی ہڈیوں پر چل رہا ہے۔ سوکھی بے جان ہڈیاں اور پیلا رنگ بھی تو اسی کا ہے۔ جس کو وہ ہمیشہ نیلے رنگ سے چھپا دیا کرتا تھا۔

سماج کے پنجر اس کے سامنے گھوم رہے تھے اور خاک و خون میں لتھڑی ہوئی بیجان مورتیاں اور اس کا برش تیزی سے چل رہا تھا ——— چہرہ پہ زرد زرد پتوں کا عکس اور اس کے چاروں طرف سیاہ سیاہ دھواں سا اٹھتا ہوا ——— اور بھوک کی صورت جیسے طوفانی رات میں چراغ کی لو کانپ رہی ہو۔ پنکھڑیوں سے ہونٹوں پہ وہ پیلا پیلا رنگ پھیر رہا تھا۔ اس کی آنکھوں نے ایسے ہی خشک ہونٹ دیکھے تھے جو بھوک اور پیاس کی شدت کا پتہ دے رہے تھے۔ ہفتوں کی بھوک ان ہونٹوں میں دکھائی تھی۔ وہ آج کتنا مطمئن نظر آرہا تھا۔

شاید یہی تصویر تھی، جس کی تیاری وہ عرصہ سے کر رہا تھا۔

ٹن۔ ٹن۔ ٹن۔

گھڑی کی آواز سے وہ چونک پڑا۔ تین بج گئے تھے۔ کتنی رات گزر چکی تھی اب اسے سونا چاہیئے تھا۔ کل وہ اپنی تصویر مکمل کرے گا۔ اس نے برش ایک طرف رکھ دیا اور اپنے ہات کی انگلیوں کو سیدھا کرنے لگا۔ برش پکڑے پکڑے اس کے ہات کی انگلیاں کیسی اکڑ گئی تھیں۔ وہ اس تصویر کے بنانے میں کتنی محنت کر رہا تھا۔ وہ خوش ہو رہا تھا۔ جس دن اس کی تصویر تیار ہو جائے گی وہ اپنی اس تکلیف کو بھول جائے گا جو اسے دن رات بیٹھ کر ہوتی ہے۔

اس نے تصویر کو ایک طرف احتیاط سے رکھ دیا۔ رنگوں کی پیالیاں بھی اٹھا کر الماری میں رکھ دیں۔ اور چراغ گل کر کے لیٹ رہا۔ مگر نیند کہاں۔ ہر پھر کر وہی تصویر اس کے آگے آجاتی اور وہ اپنے خوابوں کی بستی میں بھی وہی تصویر دیکھتا رہا۔ معلوم نہیں کب تک ـــــــ

صبح ہوئی تو سنیل پھر اپنی تصویر میں لگ گیا۔ اسے تو اپنی تصویر کے مکمل کرنے کی دھن لگی ہوئی تھی۔ کھانا پینا بھی دوبھر ہو رہا تھا۔ آج نہیں تو کل اس تصویر کو ضرور پورا کرے گا۔ اس نے تصویر کو ہاتھ میں اٹھا کر دیکھا۔ آنکھیں کالی کالی آنکھیں ـــــــ مگر ابھی ان میں چمک تو آئی نہیں۔ اس نے باریک برش اٹھا کر سر جھکا لیا مگر بھوکی عورت کی آنکھوں میں چمک ـــــــ اس کو اپنی بیوقوفی پر غصہ آیا۔ اتنا بڑا آرٹسٹ اور اس نے یہ نہیں سوچا کہ بھوکی عورت کی آنکھوں پر ویسے بھی مردنی چھائی ہوتی ہے۔

اس وقت اس کی پچھلی تصویریں باری باری اس کی آنکھوں کے سامنے آ رہی تھیں۔

کالی کالی آنکھیں۔ چمکدار بڑی بڑی۔ وہ گھنٹوں اپنی بنائی ہوئی ان آنکھوں کو دیکھتا رہتا تھا۔ کتنی خوبصورت تھیں یہ آنکھیں ـــــــ مگر نہیں میری بنائی ہوئی ان آنکھوں کی لڑکیاں تو نظر نہیں آتیں ـــــــ کوہ قاف کی پریاں۔ بچپن میں اس نے کتنی کہانیاں پڑھی تھیں پریوں کی ـــــــ یہ پریاں کتنی

خوب صورت ہوتی تھیں، مگر میری تصویروں جیسی تو کیا ہوں گی ۔ اس کی نظر اپنی نامکمل تصویر پہ پڑی ۔ مگر نہیں، میری یہ تصویر میرا شاہ کار ہے ۔ یہ تصویر ایک زندہ انسان کی تصویر ہے ۔ ہر چند اس کی آنکھیں بے نور ہیں ۔ لیکن ہے تو حقیقت اور وہ کالی کالی چمکدار آنکھیں ایسی آنکھیں ہوتی بھی ہیں ؟ مگر میری تصویر جیسی آنکھیں کسی کی نہیں ہوتیں ——— میں نے اس دوشیزہ کی آنکھیں کس قدر خوبصورت بنائی تھیں سپنوں کی بستی میں بھی ایسی سندر لڑکیاں نہیں بستیں ۔ اور یہ عورت ——— بھوکی عورت ——— ایسی تو بنگال کی سڑکوں پر ہزاروں دکھائی دیتی ہیں سیپی کی سی لمبی لمبی آنکھیں جیسے جل پریاں ہوں مگر بھوک نے ان کی چمک چھین لی ہے اس نے برش ایک طرف کو رکھ دیا اور قلم کی نوک سے کالی کالی پلکیں بنانے لگا ۔ نکیلی لمبی لمبی پلکیں سیپی کی طرح آنکھیں جھکی جھکی اور ادھر ادھر دھوئیں کے کالے کالے غبارے ۔ کیسی اندھیاری ہے ۔ جس میں جیون بھی سانس نہیں لے سکتا ۔ دھوئیں کی کپکپاتی لہریں جیسے کالے ناگ لہرا رہے ہوں اور ان میں یہ جل پریاں چیونٹیوں کی طرح رینگ رہی ہیں ——— اس کا برش اس کالی کالی اندھیاری میں دوڑ رہا تھا ۔ کالا رنگ ——— پیلا پیلا رنگ، پھیکا پھیکا ۔ اس کی ساری تصویریں انہیں رنگوں سے رنگی ہوئی تھی ۔ نیلا اور چاندنی رنگ ہوگا ۔ اس کے سپنوں کی بستی کا وہ ان کے متعلق سوچ بھی نہ سکتا تھا ۔ اس نے اپنی گردن کو ہلکی سی جنبش دی ۔ جیسے اس تصویر کے علاوہ اور کچھ سوچنا نہیں چاہتا تھا اس نے اپنی کتنی راتوں

کی نیند اس تصویر میں جذب کی ہے۔ بھوک اور پیاس میں کہیں نیند بھی آتی ہے۔ وہ سوچنے لگا۔ جس عورت کی وہ تصویر بنا رہا ہے معلوم نہیں، کب سے وہ نیند کے لئے ترس گئی ہوگی۔ دنیا گردشش کرتی دکھائی دے رہی تھی اور سنیل اس کے پردوں پہ اڑ رہا تھا۔ سندر سندر سپنوں سے نکل کر آندھی اور طوفان کی دنیا کی طرف، لاشوں کے انباروں میں ــــــ سسکتے دم توڑتے انسانوں میں ــــــ ــــ سارے دن وہ اس تصویر میں لگا رہا مگر ابھی تو اس تصویر میں بہت کام باقی ہے اس کے مکمل ہونے میں کئی دن لگیں گے۔ اس نے تصویر کو اٹھا کر غور سے دیکھا۔ یہ اس کا غیرفانی شاہ کار ہے۔ آنے والی نسلیں اس کی اس محنت کو بھول نہیں سکیں گی وہ فخریہ انداز میں مسکرایا۔

دن چھپ رہا تھا۔ آج کتنی جلدی وقت گذر چکا تھا۔ اسے روٹی بھی تو لانی ہے وہ تصویر کو رکھ کر اٹھ کھڑا ہوا اور دروازہ بند کرکے دوکان پہ چل دیا۔ آج تو اس کی تصویر مکمل ہو جانی چاہیئے۔ آخر سارے دن محنت کی ہے یہ تصویر اس کی زندگی کو بدل دیگی، سچ مچ اس کی زندگی میں انقلاب آگیا ہے۔ رادھا اور کرشن کی تصویر اس کی نظروں میں پھرنے لگی یہ تصویریں ــــــ ہنک ــــــ ــــــ وہ ان کو بھول جانا چاہتا تھا ــــــ کیسی کیسی تصویریں ــــ واقعی وہ آرٹ کو صحیح معنوں میں آج سے پہلے کبھی نہیں سمجھ سکا ــــ اس کو اپنے اوپر ہنسی سی آئی "آرٹ کا جمالیاتی عنصر" وہ بڑے زور سے ہنسا احمق کہیں کا ــــــ

وہ بھی سچ مچ پہلے آرٹ کو نہ جانے کیا سمجھتا تھا " جمالیاتی عنصر" اس کے دماغ پر چھانے لگا خدا جانے یہ کیا چیز ہے ——— انجم نے اس کے سامنے جمالیات کی تشریح کی، مگر اس نے بھی سمجھ کر نہ دیا۔ لیکن اس کی وجہ حقیقت میں اسکی شہرت تھی ۔ اسکی چیزوں کو لوگوں نے اتنا پسند کیا کہ وہ اپنے کو نہ جانے کیا سمجھنے لگا تھا اس وقت اس کا یہ احساس اس کے دماغ پر بری طرح چھایا ہوا تھا۔ جتنا وہ اسے بھولنا چاہتا تھا اتنا ہی وہ اور سامنے آتا تھا۔ اس کا فن زندگی کی حقیقتوں سے کتنا دور جا پڑا تھا۔ نیلی نیلی ساریاں یہ بھی کوئی زندگی ہے ۔ یکایک وہ گھبرا سا گیا ہے ۔ ہڈیوں کا ایک ڈھانچہ حرکت کر رہا تھا اس کے لب ہل رہے تھے، جن سے چند ٹوٹے پھوٹے فقرے نکل رہے تھے ۔ اس کی آنکھوں کے گرد گہرے گہرے سیاہ حلقہ پڑے ہوئے تھے، پھٹی پھٹی آنکھیں، کھلے ہوئے پریشان بال۔ جیسے اس کا سہاگ لٹ گیا ہو، جیسے وہ واویلا کرنا چاہتی ہے، مگر وہ تو سراپا فریاد ہے اس کی شکل سے وہ ڈر گیا، وہ محبت اور ہمدردی کو ڈھونڈھ رہا تھا، مگر ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ جیسے وہ کہہ رہی ہے کہ " دیکھو میری یہ حالت ہے۔ میں بھوکی مر رہی ہوں میں تھوڑی دیر اور زندہ رہوں گی، لیکن تمہارے سماج نے میرا یہ حال کر دیا ہے تم میری دھوتی کو دیکھتے ہو۔ یہ پھٹ کیوں گئی ہے۔ پھر بھی میں اسے پہنے ہوں ۔ یہ میرا ہی لباس نہیں ہے میری طرح ہزاروں نادیدہ زندگیاں ایسی ہیں "

سنیل کانپنے لگا ——— یہ شکل ——— اس نے گردن کو زور سے

جھٹکا دیا۔ اس کی تصویر تو کسی وقت بھی اس کا پیچھا نہیں چھوڑتی، ہر وقت سائے کی طرح اس کے ساتھ رہتی ہے۔ ردی والی کی دوکان پر بھی تو اُسے نہیں چھوڑتی۔ وہ تھوڑی دیر کے لئے اسے بھول جانا چاہتا تھا۔ وہ اس کو بھولنے کی ناکام کوشش کرتا رہا ——— اس کے ذہن میں پھر وہی تصویر آئی ——— اب تو یہ ترتیب قریب پوری ہوگئی ہے۔ ذرا سا کام باقی ہے۔ آج ردی بیچنے کے بس اسکے نشان ہی تو مٹانے ہیں۔ اس کے گالوں کا رنگ ذرا ہلکا کرنا ہے کچھ تیز ہوگیا ہے۔ کل صبح جب وہ سو کر اٹھے گا تو اس کی تصویر بالکل تیار ہوگئی ہوگی۔ اس کے سامنے اخباروں کی خبریں آرہی تھیں۔ کتنے اخباروں میں آچکا ہے "مسٹر سینیل ایک تصویر بنا رہے ہیں جو اپنی نوعیت کی پہلی تصویر ہوگی"۔ اس نے بھی سب کو اندھیرے میں رکھا ہے۔ کل وہ رپورٹر ملا تھا، اس نے کتنا ہی معلوم کرنا چاہا مگر اس نے بھی نہ بتایا۔ وہ دل ہی دل میں خوش ہورہا تھا۔ اسی ہفتہ میں وہ کتنا بڑا آدمی ہو جائے گا۔ بمبئی میں نمائش ہورہی ہے۔ کتنے تار اس کے پاس آچکے ہیں۔ وہ اس تصویر کو خود لیکر جائے گا۔ کتنا لطف آئے گا۔ بمبئی میں تو بس مزے ہی ہونگے تاج محل ہوٹل میں ٹھہرنے کا انتظام ہوا ہے۔ خیر وہاں دیکھا جائے گا۔ کتنے آدمی روزاس سے ملنے آئیں گے۔

مبارک باد دینے والوں کا تو تانتا بندھا رہے گا۔ ایسے معلوم ہو رہا تھا کہ جیسے اس کی تصویر مکمل ہوگئی ہو۔

اب دوکان قریب آگئی تھی سامنے روٹی بیچنے والی لڑکی بیٹھی تھی ۔ اور اسی کی طرف دیکھ رہی تھی ۔ جیسے اسی کا انتظار کر رہی ہو ۔ وہ کھڑی ہوگئی ۔

"روٹی چاہئے"

سنیل دوکان کے قریب پہنچا بھی نہ تھا کہ لڑکی نے پوچھا ۔

"ہاں باسی روٹی چاہئے"

"باسی؟"

"ہاں باسی"۔

سنیل نے پھر جواب دیا

وہ سنیل کی انگلیوں کو دیکھنے لگی ۔ جن میں جا بجا رنگ لگا ہوا تھا ۔ وہ روٹی دیدے ۔ اگر روٹی دیدی تو وہ فوراً ہی لیکر چل دے گا ۔ اور اس نے کتنی باتیں اس سے پوچھنے کے لئے سوچی تھیں ۔ وہ کچھ بھی نہ پوچھ سکے گی ۔ وہ اپنی لٹکائی ہوئی تصویر کی طرف دیکھنے لگی اور پھر سنیل کی طرف دیکھا کہ وہ بھی اس کی تصویر دیکھ رہا ہے یا نہیں ۔

"تم تصویریں بناتے ہو؟"

اس نے سنیل سے پوچھا ۔

"ہاں" ——— اور سنیل کی نظر بھی اس تصویر پہ پڑی ۔ یہ تو اسی کی بنائی

ہوئی تصویر ہے اسی بنگالی دوشیزہ کی۔

"تم نے یہ تصویر دیکھی؟" لڑکی نے پوچھا۔ اور داد طلب نظروں سے سنیل کی طرف دیکھا۔

"ہاں دیکھی"

"کیسی ہے؟ بڑے مشہور آدمی کی بنائی ہوئی ہے۔ سنیل کی"

"سنیل کی!" وہ دل ہی دل میں ہنسا۔

"ہاں اچھی خاصی ہے"

اس نے یوں ہی لاپرواہی سے جواب دیا وہ جل کر کوئلہ ہی تو ہو گئی۔ کتنے مشہور آدمی کی بنائی ہوئی تصویر ہے۔ خود جیسے بڑی اچھی اچھی تصویریں بناتے ہوں گے۔

"لاؤ ـــــــ جلدی روٹی دیدو" سنیل نے چٹکی بجائی۔ اس کو تو جانے ہی تصویر بنانی تھی اور یہ بلاوجہ وقت خراب کر رہی تھی۔ اس کے ماتھے پر شکنیں پڑ گئیں۔

ہاں اسے روٹی دینی ہے وہ تصویر کے خیال کو بھول گئی۔

"تازی روٹی لیلو" ـــــــ اس نے ہمدردی کے لہجے میں کہا۔

"نہیں باسی ہی دو" سنیل کو اس کے بھولے پن پر ہنسی سی آئی۔

"کتنا غریب آدمی ہے" وہ دل ہی دل میں سوچنے لگی روز باسی روٹی بچا؟ ہے اور وہ بھی بغیر سالن کے۔

اسے سنیل سے ہمدردی سی پیدا ہو گئی ۔ وہ اٹھ کر کوٹھری میں گئی ۔ روٹی نکالی اور پھر رکھ دی ۔ سالن کی دیگچی کھولی ایک منٹ سوچتی رہی اور پھر خود بخود ہنس پڑی وہ دو باسی روٹیاں لیکر باہر آئی ، اس کا چہرہ تمتما رہا تھا ۔ قدم کہیں کے کہیں پڑ رہے تھے ۔

"یہ لو روٹی !"

اس کے ہاتھوں میں کپکپاہٹ سی ہو رہی تھی اور سانس پھول رہا تھا ۔ سنیل نے روٹی لی اور گھر کی طرف چل دیا ۔ اور وہ وہیں مونڈھے پر بیٹھ گئی ۔ آج اس نے اس کی روٹیوں میں مکھن کی گولی لگا دی ۔ بچارا روز روکھی روٹی کھاتا ہو گا ــــــ جب دیکھے گا تو ــــــ وہ گھبرا سی گئی ۔ معلوم نہیں وہ کیا سمجھے ۔ کہیں یہ نہ سوچنے لگے کہ میں اس سے پریم کرتی ہوں جبھی تو اس کے کھانے کے لئے ایک مکھن کی گولی بھی لگا دی ہے ۔ وہ سوچتے سوچتے شرما گئی ــــــ اے بھگوان میں اس سے کہہ دیتی تو اچھا تھا ــــــ پر کہدیتی تو وہ ہرگز بھی نہ لیتا ۔ میں نے کتنا چاہا کہ تازی روٹی دیدوں ۔ مگر اس نے باسی ہی لی ۔ اور تھ ــــــ کیا ہوا اگر بغیر کہے دیدی تو سوچنے دو کچھ بھی سوچے ۔ مگر کل آ کے وہ کہیں بگڑنے جائے وہ سوچتے سوچتے ڈر گئی ۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ اسے غصہ آ جائے اور پھر یہاں روٹی لینے نہ آئے ۔ آئے گا تو ضرور یہاں اور کوئی دکان بھی تو نہیں ہے ۔ اس نے برا کیا ۔ معلوم نہیں کیا کیا سوچے گا ۔ سوچنے بھی دو اس کا کیا بگڑتا ہے

پہ مکھن لگا دیا مکھن ——— مکھن لگی ہوئی روٹی اس کے نظروں کے سامنے پھر گئی۔ مکھن اس نے کبھی زندگی میں کھایا تو نہ ہوگا۔ مگر آج بہت خوش ہوگا۔ کل پھر ضرور آئے گا۔ ممکن ہے کہ یہ سوچے کہ شاید دھوکے سے دے گئی ہے۔ اچھا ہے یہی سمجھے، لیکن وہ چاہتی تو یہی تھی کہ اسے معلوم ہو جائے کہ اس نے جان کر دیا تھا۔ مگر نہیں ——— نہیں ——— وہ گھبرا سی گئی ——— غریب آدمی ہے۔ بچارا روز باسی روٹی کھاتا ہے۔ آج اس نے اچھا کیا جو اس میں مکھن لگا دیا۔ کل آئے گا تو اسے کچھ ترکاری ضرور دیدوں گی۔ لے تو لے گا۔ جب میں کہوں گی کہ اس کے پیسے بھی اتنے ہی ہوئے۔ پر یہ تو کچھ اچھا نہ ہوا۔ آخر وہ کیا سوچے گا کہ اس نے ایسا کیوں کیا۔ کہیں یہ نہ سمجھے ——— اس کے آگے وہ سوچنا نہ چاہتی تھی۔ اس نے جسم میں جھرجھری سی محسوس کی ——— آخر وہ اُس شخص سے اتنی دلچسپی کیوں لینے لگی تھی۔ وہ بار بار سوچتی تھی مگر اس کے سمجھ میں کچھ نہ آتا تھا۔ ایسے تو اس کی دوکان پہ بہت سے آدمی آتے ہیں۔ اتنے غریب آتے ہیں کہ جن کے پاس روٹی خریدنے تک کو دام نہیں۔ پھر آج کل تو برا حال ہے مہنگائی نے چوپٹ کر دیا ہے۔ اس کی نظر سامنے والی تصویر پہ پڑی۔ کتنی خوبصورت ہے اس لڑکی کی تصویر اس نے تصویر کو اور غور سے دیکھا۔ پہ بہت زیادہ اچھی تو نہیں ہے، دادا کہتے تھے کہ میں نے اس سے اچھی تصویر آج تک نہیں دیکھی مگر وہ تو اپنے پیسے کی وجہ سے کہتے ہوں گے انھوں نے جب روپیہ لگا کر خریدی تھی تو ان کے لئے تو اچھی ہوئی ہی

یوں ایسی بری بھی تو نہیں ہے۔ سنیل کی بنائی ہوئی تصویر، بڑا مشہور آدمی ہے۔ ہاں اس میں برائی ہی کیا ہے۔ اچھی تو ہے۔ مگر وہ کہہ رہا تھا۔ "ہاں خاصی ہے"۔ اس کو ہنسی سی آئی، اتنے بڑے آدمی کی تصویر اور آپ کہتے ہیں کہ "خاصی ہے"۔ گویا میں زبردستی ہی کہلوا رہی تھی۔ جیسے آپ بڑی اچھی بناتے ہوں گے ایسے ہوتے تو بھلے دن بھی نہ ہوتے۔ کاہے کو باسی روٹی کھاتے۔ لیکن آج تو مزا کر رہا ہوگا۔ مکھن ——— روٹی معلوم نہیں کہاں کا رہنے والا ہوگا۔ یہاں کا تو معلوم نہیں ہوتا۔ شاید کوئی بنگالی ہوگا۔ ہاں بنگالی ہی ہے۔ وہیں کے لوگ بھوکے مر رہے ہیں معلوم نہیں بچارا کس مصیبت میں یہاں آیا ہے۔ کہیں کا بھی ہو آج تو مکھن روٹی کھا رہا ہوگا۔ مجھے تو وہ زندگی بھر بھولے گا نہیں وہ دل ہی دل میں خوش ہو رہی تھی۔ آج اس نے اچھا کیا۔ بھگوان بھی خوش ہوا ہوگا ——— پیسے والے تو سب ہی اچھی سے اچھی چیزیں کھاتے ہیں۔ غریبوں کو کہاں میسر۔ نہیں اب تو وہ روز اسے کچھ نہ کچھ دیا کرے گی باہر کا رہنے والا ہے تو کیا ——— یاد تو کرے گا۔ پر آدمی بھی بڑا اچھا معلوم ہوتا ہے۔ کتنی کتنی دیر اسے دوکان پہ کھڑا رہنا پڑتا ہے ہائے بھوک ——— بھوک بھی انسان کو کتنا لاچار کر دیتی ہے کتنا اچھا ہے وہ آدمی اب کے آئے گا تو وہ اس سے پوچھے گی کہ کہاں رہتا ہے، وہ سوچتے سوچتے ہنس پڑی بھلا یہ بھی کوئی پوچھنے کی بات ہے۔ وہ بھی ہنسے گا کہ کتنی بیوقوف لڑکی ہے۔ اُسے کیا پڑی ہے کہیں رہتا ہوگا وہ مونڈھے

سے اٹھ کھڑی ہوئی اور دوکان کے باہر دیکھنے لگی ۔ سامنے والی سڑک پر کوئی دوڑتا ہوا ادھر ہی آرہا تھا پر یہ چلا کیوں رہا ہے ۔ اونھ ہوگا کوئی باؤلا۔ کل بھی ایک پھر رہا تھا جیسے ہات نچا نچا کر گا رہا تھا۔ لوگ ہنس رہے تھے اس نے جھانک کر دیکھا۔ قریب کی دوکان پہ سب ہی لوگ ادھر دیکھ رہے تھے اس سڑک پہ کچھ اندھیرا ہے۔ صاف دکھائی نہیں دیتا ——— اونھ ——— اُسے کیا پڑی ہے وہ پھر جاکر اپنے مونڈھے پر بیٹھ گئی۔ پہ اس کا جی نہ مانا وہ گھبرا بھی رہی تھی۔ بھگوان جانے کیوں اس کا دل آپ ہی آپ بے چین ہو رہا تھا۔ اس شخص کے چلانے کی آواز اس کے کانوں میں دھنسی جا رہی تھی ۔ بھگوان جانے کون مصیبت مارا ہے۔ وہ اس سڑک کی طرف دیکھنے لگی ۔ اب وہ آدمی دوکان کے بہت قریب آچکا تھا۔

"ہے بھگوان"

اس کا دل اور زبان دونوں چلائے ۔ "ارے یہ تو وہی آدمی ہے جو روز باسی روٹی لیجاتا ہے ۔ وہ تھر تھر کانپنے لگی ۔ ارے کیا ہو گیا یہ کیوں چلا رہا ہے" اس نے کتنے ہی سوالات دل ہی دل میں کر ڈالے

"مکھن ——— مکھن ——— میری تصویر" اس کے ہاتھ میں ایک کاغذ تھا جس پر شاید کوئی تصویر بنی تھی اور ایک ہات میں باسی روٹی مکھن لگی ہوئی لئے تھا۔ دوکاندار سب اٹھ اٹھ کر اس کے قریب آگئے۔ راہ گیر بھی

بھی رک کر دیکھنے لگے۔

"کیا ہے بھیا؟" ایک آدمی نے پوچھا۔

"میری تصویر۔"

اس نے تصویر والا ہاتھ آگے کو بڑھا دیا —— دھوکے باز دنیا —— وہ زار و قطار رو رہا تھا۔

"او لڑکی تجھے کیا ملا —— ہائے میری تصویر۔"

لوگ حیرت سے ایک دوسرے کا منہ تک رہے تھے، کوئی بات بھی تو معلوم نہ ہوتی تھی وہ ٹوٹے پھوٹے بے ربط جملے بک رہا تھا اس کا دماغ خراب ہو رہا تھا اور اب رہے سہے ہوش و حواس بھی ختم ہو چکے تھے۔

اس کی آنکھوں کے آگے تصویریں ہی تصویریں تھیں لاتعداد تصویریں "میری تصویر یہ میرے آرٹ کا شاہکار ہے" اس نے پھر اسی سفید کاغذ کو ہاتھ میں اٹھا لیا۔ "آج تو یہ مکمل ہو جائے گی کتنی اچھی ہے یہ تصویر" میں اس کو نمائش میں لے کر جاؤں گا۔ اخباروں میں اس کا ذکر ہوگا۔ کل صبح میں دنیا کا سب سے بڑا آدمی ہوں گا۔ ہاہا —— وہ زور سے ہنسا —— اور پھر اسے باسی روٹیوں کے ڈھیر دکھائی دے رہے تھے۔ مکھن لگی ہوئی روٹیاں۔ مکھن کی ایسی بڑی بڑی گولیاں —— ہائے میری تصویر کا رنگ —— مکھن —— روٹی —— اور لڑکی —— وہ چلاتا ہوا بھاگا ——

زندگی

جاڑوں کی اندھیری رات تھی موسلا دھار بارش ہو رہی تھی، بادلوں کی گرج فضا کو انتہائی ہیبت ناک بنا رہی تھی۔ ہر طرف اندھیرا ہی اندھیرا چھایا ہوا تھا جیسے کائنات کالی چادر میں لپٹ گئی ہو۔ کبھی کبھی بجلی چمک کر سامنے کے اونچے پہاڑوں کی برفیلی چوٹیوں پہ ایک چلبلی روشنی پیدا کر دیتی تھی۔ سامنے بہنے والی ندی کا پانی پارے کی طرح تھلکنے لگتا۔

بڑھیا اپنے بستر سے اٹھی اور کھڑکی کے باہر سر نکال کر دیکھنے لگی۔ تھوڑی دیر یونہی کھڑی رہی اور پھر کھڑکی بند کر کے آتشدان کے قریب جا کر بیٹھ گئی ــ وہ اداس تھی ــــ مگر اس کا غم نہ تو اندھیرے گھر پہ، نہ کالی رات پہ اور نہ بجلی کی کڑاک پر، نہ آندھی کی تیزی پہ تھا، بلکہ وہ کسی گزرے ہوئے وقت کو یاد کر رہی تھی، اور جوں جوں اس کی یاد تازہ ہوتی تھی اس کا

غم بڑھتا ۔۔۔ ننھے نادان بچے جو دیر سے آتش دان کے قریب کھیل رہے تھے دوڑ کر بڑھیا کو لپٹ گئے اور ایک ساتھ معصومانہ انداز میں چلائے۔

"دادی اماں! ۔۔۔ آج پھر ایک کہانی سناؤ کل والی کہانی تو بڑی اچھی تھی" بڑھیا نے بچوں کو ٹالنے کی ایک ناکام کوشش کی۔

"بیٹا آج تو کوئی کہانی یاد نہیں ۔۔۔ کل یاد کر کے سناؤں گی، دیکھو کتنی سردی پڑ رہی ہے۔ ہوا بھی دیوانی ہو رہی ہے اور مینہ بھی۔ جاؤ اب سو جاؤ کہیں ایسا نہ ہو کہ ٹھنڈ لگ جائے اور طبیعت خراب ہو جائے۔

"دادی اماں! آج تو ہم کو نیند نہیں آتی۔" ایک بچہ نے سنجیدہ صورت بنا کر کہا۔

"کیوں بیٹا آج تم کو نیند کیوں نہیں آتی؟ روز تو تم سر شام ہی سے سو جایا کرتے تھے بڑھیا نے بچہ کو پیار کرتے ہوئے پوچھا

"دادی اماں! ۔۔۔ ارے تم بھول گئیں کل عید ہے کیا اچھا ہو اگر ابھی صبح ہو جائے۔ چھوٹے بچہ نے خوش ہو کر کہا۔

بڑھیا جی میں خوش تھی کہ چلو عید کی خوشی میں بچے کہانی سننا بھول گئے۔

"دادی اماں! ۔۔۔ کیا تم ہمارے عید کے کپڑے دیکھو گی؟ ایک بچہ نے خوش ہو کر کہا

"ہاں ہاں ۔۔۔ ضرور" ۔۔۔ بڑھیا نے جواب دیا۔

بچے اپنے کپڑے لانے کے لئے کمرے کی طرف دوڑے

بڑھیا اٹھی، کھڑکی کے قریب گئی، پٹ کھولے تو دیکھا بارش تھم چکی تھی، بادل چھٹ گئے تھے، آسمان پر تارے چھٹکے ہوئے تھے۔ جن کی ضو فشانی سے اندھیرا ابھی کچھ کم ہو گیا تھا۔ ندی کا پانی بدستور بہہ رہا تھا، اور اس کی مضطرب لہروں میں تاروں کا عکس کانپ رہا تھا۔ پاس ہی مولسری کی شاخیں ساحل در آغوش تھیں۔ بڑھیا دل بہلانے کے لئے کچھ دیر تاروں بھری رات دیکھتی رہی۔ پھر کھڑکی بند کر کے اپنی جگہ آ بیٹھی۔

بچوں نے آتش دان کے قریب کپڑوں کا ایک انبار لگا دیا لیکن پھر اسی انداز سے بولے

"دادی اماں! — تم نے ہمارے کپڑے تو دیکھ لئے، اچھا اب کہانی سناؤ۔"

بڑھیا کے خیالات کا تسلسل کچے دھاگے کی طرح ٹوٹ گیا۔

"اچھا آؤ" —— اس نے نحیف آواز میں کہا —— "میں آج تم کو ایک سچی کہانی سناؤں گی۔"

بچے کہانی سننے کی امید میں آتش دان کے ادھر ادھر بیٹھ گئے اور دادی کے چہرے کی طرف ٹکٹکی باندھ کر دیکھنے لگے۔ اور "ہوں" "ہاں" کا تار باندھ دیا۔ بڑھیا نے آتش دان کے نیلے پیلے شعلوں کو دیکھتے ہوئے کہانی شروع کی۔

"سنو بچو! —— وہ سامنے ندی کے کنارے مولسری کا درخت کھڑا ہے اس سے کچھ دور جہاں اب ہری ہری گھاس اُگ رہی ہے کوئی بیس برس گزرے ایک پھوس کی جھونپڑی میں ایک غریب شخص حامد رہتا تھا۔ اس کی نوعمر بیوی کے گود میں دو سال کا

خوب صورت بچہ تھا ـــ یہ تھا اس کا دھن "۔

یہاں تک کہہ کر بڑھیا چند لمحات کے لئے خاموش ہو گئی، شاید وہ ماضی کے ان جگر خراش واقعات کو یکجا کر رہی تھی جو برچھیوں کی طرح اس کے دل کو گھیرے ہوئے تھے۔

"یوں سمجھو، انھیں دنوں کی ایک ایسی ہی سرد رات تھی جب کہ غریب اپنی جھونپڑیوں میں اور سرمایہ دار اپنے محلوں میں دنیا و مافیہا سے بیخبر میٹھی نیند کے مزے لے رہے تھے، چاند اپنی سیمیں کرنیں ندی کی مضطرب موجوں کی بھینٹ چڑھا رہا تھا ہر طرف اندھیری رات کی سی خاموشی چھائی ہوئی تھی، لیکن کبھی کبھی قریب کی اس جھونپڑی سے حامد کے معصوم بچہ کی لرزتی ہوئی آواز، " اماں! اماں!! ـــــ روٹی ـــــ!! فضا کو چیرتی ہوئی نکل جاتی۔ جو تھوڑی دیر میں گونج کر فنا ہو جاتی اور پھر ہر طرف وہی خوفناک سکوت چھا جاتا ـــــ قدرت بھی کیسی کرشمہ ساز ہے۔ سرمایہ دار تو عالیشان محلوں میں مخملی گدّوں پر بے فکری کی نیند سوئیں اور دن میں کئی کئی بار عمدہ عمدہ غذائیں کھائیں، اور ایسی رنگین اور پرتکلف دنیا میں کھوئے رہیں، مگر غریب کو رات بسر کرنے کے لئے ایک چادر بھی میسر نہیں۔ زندگی کے کٹھن دن گزارنے کے لئے سوکھے ہوئے ٹکڑے بھی نہیں۔ انھیں بدنصیب ہستیوں میں سے ایک حامد بھی تھا جس کے یہاں اس روز دو دن سے کچھ کھانے کو نہ تھا، گو حامد اپنی تکلیف سے بیخبر نہ تھا لیکن اس سے اپنی بیوی اور معصوم بچہ کی تکلیف نہ دیکھی جاتی تھی حامد نے پریشان نظروں سے بچہ کی طرف دیکھا اور پھر بیوی کی طرف جو سردی سے پریشان آگ کے قریب

بیٹھی تھی۔

"ثریا!" ـــــــ اس کے منہ سے نکلا "مجھ سے تمہارے آنسو نہیں دیکھے جاتے"۔ حامد کی نگاہیں آگ کی لہراتی ہوئی لپٹوں پہ جم کر رہ گئیں۔ ثریا کی آنکھوں سے بہنے والے آنسو آگ کی روشنی میں روپہلے موتی بن کر ڈھلک رہے تھے۔

"کاش دربار ایزدی میں ان آنسوؤں کی کوئی قدر و قیمت ہوتی"۔ بڑھیا نے یہ کہتے ہوئے ایک آہ سرد بھری اور پھر کہنا شروع کیا " حامد کی ڈبڈبائی ہوئی آنکھیں آہستہ آہستہ اٹھیں اور ثریا کے آنسوؤں کو اپنی آنکھوں میں جذب کرنے کی لاحاصل کوشش کرنے لگیں۔ لیکن باوجود ضبط کے بھی اس کی آنکھوں سے آنسو نکل پڑے۔ اس نے اپنا منہ پھیر لیا لیکن ثریا کی نظر پڑ ہی گئی وہ تلملا اٹھی۔ آج اس نے پہلی بار حامد کی آنکھوں میں آنسو دیکھے تھے۔

"میرے سرتاج!" ـــــــ وہ آہستہ سے بولی، اس کی آواز بانسری کی گنگری کی طرح تھرتھرا رہی تھی۔ "تم اس قدر آزردہ کیوں ہوتے ہو!" یہ کہہ کر وہ خاموش ہو گئی اور آنسو اس کے دامن پر ساون بھادوں کا سماں دکھلانے لگے

حامد اپنے پھٹے ہوئے دامن سے آنسو پونچھنے لگا۔

ثریا! ـــــــ کیا کروں مجھ سے تمہاری یہ حالت نہیں دیکھی جاتی۔ اور پھر یہ بچہ ـــــــ ننھی سی جان الگ تڑپ رہا ہے"۔ اس کی آواز گلوگیر ہو گئی، آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔ لیکن اس نے ان کو ایک دردناک آہ میں

تحلیل کر دیا۔

بڑھیا کی آنکھیں ڈبڈبا رہی تھیں۔ آنسو بہنے کے لئے بیچین تھے۔

بڑھیا نے نظریں اٹھائیں اور کھڑکی سے باہر کی طرف دیکھنے لگی۔ ہوا کچھ ٹھہر گئی تھی، ستارے مسکرا رہے تھے، لیکن رات ویسی ہی ڈراؤنی اور اندھیری تھی۔ گویا فضا کا ذرہ ذرہ اس دردناک کہانی سے متاثر ہو رہا ہے۔

"ہاں دادی اماں! —— پھر کیا ہوا —— کیا وہ بھوکے مر گئے؟" ایک بچہ نے سادگی سے پوچھا۔

"نہیں —— وہ مرے نہیں —— تم خاموشی سے سنے جاؤ"

بڑھیا نے جواب دیا اور پھر کہنا شروع کیا۔

حامد نور کے تڑکے مزدوری کی تلاش میں نکل جاتا، لیکن قسمت سایہ کی طرح اس کے پیچھے تھی، برے بھلے ایک ہفتہ گزر گیا۔ اس نے کسی نہ کسی طرح اپنے دن گزارے مختصر یہ کہ ایک ہفتہ کی پیہم کوششوں کے بعد وہ ایک پنساری کی دوکان پہ دو آنہ روزنہ پر ملازم ہو گیا۔ ہارے تھکے دل نے ذرا اطمینان کا سانس لیا۔ اب کیا تھا دنوں سے ہفتے اور ہفتوں سے مہینے گزر گئے۔ مگر حامد کی ناؤ منجدھار میں پھنسی ہوئی تھی ساحل کا کہیں پتہ نہ تھا، تاہم اس نے ہمت اور استقلال کا دامن ہاتھ سے نہ چھوڑا اور مردانہ وار تمام مصائب کا مقابلہ کرتا رہا —— گو حامد کی بھاگتی

اور محنت نے رامچندر کے خیالات پر بہت اثر کیا۔ مگر اس کو کئی کئی دن بھی اجرت نہ ملتی تھی۔ رات کو دوکان بند کرتے وقت جب وہ رام چندر سے اپنی مزدوری طلب کرتا تو رام چندر اس کو ٹال دیتا۔ دو آنے کی جگہ چار پیسے ہات پر دھر دیتا۔ اور وہ اپنی قسمت کو دوش دیتا ہوا خاموشی سے گھر کی طرف چل دیتا ——

"دادی اماں —— وہ آدمی کتنا خراب تھا جو اس بچارے کی مزدوری تک نہ دیتا تھا" ایک بچہ نے غمناک لہجہ میں کہا۔

"ہاں بیٹا! —— دنیا ایسی ہی ہے غریب کا کوئی نہیں ہوتا"

بڑھیا نے جواب دیا اور پھر کہانی شروع کر دی۔

ایک بار جب کہ جاڑوں کی چاندنی مفلس کی جوانی کی طرح تھی، آدمی، جانور، پنچھی، پکھیرو، سب ہی میٹھی نیند میں ڈوبے ہوئے تھے، اس وقت پریشان حال حامد ایک طرف کو جا رہا تھا، وہ ہرے بھرے میدانوں سے گزر رہا تھا، جا بجا پھول کھلے تھے، پاس والی ندی کی آواز اس طرح سنائی دے رہی تھی جیسے کوئی دم توڑ رہا ہو حامد کے قدم چلتے چلتے تھک گئے۔ اس نے ایک نظر پھولوں پر ڈالی، لیکن ان کی رنگینی میں کوئی رنگ نہ پایا اور پھر ندی کے پانی کو دیکھنے لگا۔ گو بظاہر اس کی نظریں ان رنگینیوں کو دیکھنے میں محو تھیں لیکن فی الحقیقت وہ صحرائی مخلوں کے نازنینوں کو نہیں، بلکہ ان خوش گوار مناظر میں اپنی بے نیل و مرام زندگی کا جائزہ لے رہا تھا۔ وہ ایسا محسوس کر رہا تھا، گویا دریا کی موجیں، اس کی زندگی کا عکس پیش

کر رہی تھیں، اس نے ایکبارگی اپنی نظریں پھیریں اور پھر قدم اٹھاتا ہوا ایک طرف کو چل دیا، حامد چاہتا تھا کہ وہ جلد از جلد رامچندر کے گھر پہنچ جائے ——— اور اس سے التجا کرے وہ اس کی بقیہ مزدوری میں سے کچھ دیدے، کیونکہ کل عید ہے، وہ سوچتا چلا جا رہا تھا اتنا بڑا آدمی ہے دے تو دے گا، گھر میں اناج ہی اناج بھرا پڑا ہے، روپیہ کی بھی کمی نہیں ——— وہ آنے روز میری مزدوری ہی کتنی ہے پر وہ دیتا کیوں نہیں ——— وہ سوچنے لگا کتنا کنجوس ہے ——— پیسے رکھ کر آخر اسے فائدہ ہی کیا ہوتا ہے دینا تو ہے ہی ——— لیکن وہ سمجھ نہ سکا کہ آخر وہ اس کے پیسے کیوں نہیں دیتا اور اگر دیتا بھی ہے تو کتنی دفعہ کہنے کے بعد وہ بھی تھوڑی بہت ——— رامچندر کی شکل اس کی آنکھوں میں پھر گئی جیسے وہ دوکان پہ بیٹھا ہو ——— کانوں میں بالی پہنے ہوئے ——— بڑی سی توند ——— بڑی بڑی مونچھیں ——— کتنا موٹا ہے ——— وہ اسے پیسے دیدے تو کتنا اچھا کرے اس کا بچہ بیمار ہے ——— پھر کل عید ——— "کل عید ہے" ——— یہ الفاظ اس کے دماغ میں چکر لگا رہے تھے اور وہ چلا جا رہا تھا۔

"کیا آج ہی کا دن تھا جب وہ رامچندر کے گھر جا رہا تھا اور شاید دادی اماں بھی وقت بھی ہوگا"

ایک بچہ نے غمگین لہجہ میں کہا۔

"ہاں"—— بڑھیا نے ایک آہ سرد بھرتے ہوئے جواب دیا۔ اس کی آنکھیں پرنم ہو گئیں۔ اس نے آتشدان میں کوئلہ ڈالتے ہوئے کہا۔

"بیٹا مزدور کا کل سرمایہ حیات اس کی صحت ہوتی ہے اور یہی چیز ہے جو اکثر اس سے بیوفائی کرتی ہے۔ جب مزدور کی صحت خراب ہو جائے تو اس کو سمجھ لینا چاہئے کہ فطرت اسے تمام دنیا کے تفکرات سے آزاد کر کے ہمیشہ کے لئے میٹھی نیند سلا دینے کی فکر میں ہے عام لوگ نامساعد حالات سے گھبرا کر موت کی خواہش کرتے ہیں مگر مزدور کو موت کے تصور سے بھی سکون حاصل نہیں ہوتا جب مزدور کی تندرستی کا سفینہ شکستہ ہو تو اسے تباہی اور بربادی کے گرداب میں کود پڑنے کے لئے تیار ہو جانا چاہئے۔"

حامد کی صحت بھی بے دام مزدوری کی بدولت خراب ہو گئی تھی۔ وہ رام چندر کی ڈیوڑھی پر جا کر رکا۔ اس نے نظریں اوپر اٹھائیں اور ایک حسرت بھری نگاہ آسمان کی جانب ڈالی۔ جس طرح کسی مایوس کا دل حرماں نصیبی کے سمندر میں ڈوب رہا ہو۔ پھر وہ سیڑھیوں پر چڑھتا ہوا دروازہ پر پہنچا۔ دستک دینی چاہی لیکن اس خیال سے کہ رات کافی گزر چکی ہے اس وقت اپنے آقا کو پریشان نہ کرے۔ وہ واپس ہونے لگا۔ اس کا دل ڈوبنے لگا۔ وہ سوچنے لگا، کل عید ہے سب کے بچے زرق برق لباس پہنیں گے —— ہائے میں بھی کس قدر بدبخت ہوں کہ عید کے موقع پر اپنے بچے کے لئے ایک کرتا بھی نہیں بنا سکتا —— یا الٰہی! کیا اس دنیا میں رہنے کا حق صرف امیروں ہی کو ہے۔

حامد کا دل بےچین ہو گیا، وہ پھر دروازہ کی طرف بڑھا اور لرزتے ہوئے ہاتھوں سے دستک دی لیکن کوئی جواب نہ ملا تھوڑی دیر بعد پھر اس نے دستک دی تو رامچندر کی آواز آئی۔

"کون کمبخت آمرا۔۔۔۔ بھگوان انھیں سمجھے۔ سونے بھی تو نہیں دیتے، پھر تھوڑی دیر بعد لالہ جی باہر آئے اور انتہائی قہر آلود نگاہوں سے پہلے تو حامد کا سر سے پیر تک جائزہ لیا جو اس وقت حسرت و یاس کی مجسم تصویر بنا کھڑا تھا۔ اور پھر بولے۔

کیوں خیر تو ہے۔۔۔۔ اس وقت کیوں آئے۔

حامد نے دردناک الفاظ میں پہلے تو گھر کا نقشہ کھینچ کر رامچندر کے دل میں رحم کے جذبات پیدا کرنے کی کوشش کی اور پھر ملتجیانہ نگاہوں سے لکنت آمیز لہجہ میں بقایا مزدوری کے لئے رحم کی درخواست کی۔ الفاظ ہونٹوں پہ مچل رہے تھے، وہ بہت کچھ کہنا چاہتا تھا مگر جذبات غم کی شدت سے اس کی آواز گھٹ کر رہ گئی رامچندر نے تیوری چڑھا کر کچھ اس طرح حامد کی طرف دیکھا حامد نے یہ محسوس کیا کہ وہ ایک ذلیل انسان ہے۔ انسانی ذلت اس وقت اپنے انتہائی عروج پہ ہوتی ہے جب کہ وہ خود اپنی نظروں میں ذلیل ہو جائے۔

جب رامچندر نے دیکھا کہ اس کی تیز نظریں مزدور کی امید کو مسمار کرنے میں ناکامیاب رہیں تو اس نے پرغضب لہجہ میں کہا۔ "آخر تمہارے پیسہ جمع ہی ہو رہے ہیں، آج نہیں کل مل جائیں گے گھبراتے کیوں ہو؟ یہ کوئی آخری عید تو نہیں؟

یہ جواب سن کر حامد خاموش ہو گیا۔ اور پھر واپس گھر کی طرف چل دیا۔

یہاں تک پہنچکر بڑھیا نے ایک آہ سرد بھری اور کھڑکی کھول کر باہر کی جانب دیکھنے لگی۔ آسمان کے تارے ابھی تک جھلملا رہے تھے اور زمین پر ایک ہو کا عالم تھا۔ بڑھیا نے اپنے کمزور جسم کو چادر سے پیٹا اور پھر آتش دان کے قریب آکر بیٹھ گئی۔

"ہاں دادی اماں پھر کیا ہوا؟" بچوں نے پُر اشتیاق لہجہ میں پوچھا۔

"بچو! ــــ یہاں سے کہانی بہت دردناک ہے۔ جاؤ اب سو رہو رات بہت کافی گزر گئی ہے۔ بس اب کل سنائیں گے۔

"نہیں دادی اماں ــــــــ ہم تو ابھی سنیں گے۔ ہمیں اس کہانی میں بہت مزا آرہا ہے۔ ایک بچہ نے مچل کر کہا۔

"اچھا تو ــ سنو" ــــــ بڑھیا نے پھر کہا عید کی صبح تھی ہر طرف ایک چہل پہل تھی، عورتیں اور بچے قیمتی بباس میں ملبوس ادھر ادھر پھرتے نظر آرہے تھے، لیکن حامد کا معصوم بچہ ایک ٹوٹی ہوئی چارپائی پر بیمار پڑا تھا۔ ثمریا اس کے قریب ہی بیٹھی رو رہی تھی، حامد بھی بچہ پر جھکا ہوا تھا دفعتاً دروازہ کھلا اور وہ سپاہی اندر داخل ہوئے۔ حامد کھڑا ہو گیا۔

"حامد تم حراست میں لئے جا رہے ہو"۔

"جرم"؟

"جرم ——— ہم سے پوچھتے ہو۔ تم نہیں جانتے؟"

"نہیں مجھے بالکل علم نہیں۔"

"رات تم لالہ رامچندر کے مکان پر گئے تھے؟"

"جی ہاں، گیا تو ضرور تھا۔"

"بس ان کو لوٹنے اور قتل کرنے کے جرم میں۔"

"وارے ——— کیا لالہ جی کو کسی نے قتل کر دیا؟"

"بس خاموش رہو ——— یہ کہہ کر سپاہی حامد کو وہاں سے کھینچ کر لے گئے۔

اب بچاری ثریا پر بھرے دکھ میں ایک اور مصیبت کا پہاڑ ٹوٹ پڑا ——— اور اس میں ضبط کی طاقت نہ رہی۔ وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ یکایک اس نے بچہ کی ایک ہلکی سی چیخ سنی، اس نے گھبرا کر بچہ کو گود میں اٹھایا، لیکن اس کی امیدوں کا مرکز اور اس کی حیات کا آخری سہارا اس کی آغوش میں آنے سے پیشتر ہی ہمیشہ کے لئے اس سے جدا ہو چکا تھا۔ ثریا کے منہ سے ایک ہلکی سی چیخ نکلی اور وہ وہیں گر پڑی ——— کتنی ہی دیر وہ بیہوش پڑی رہی جب ہوش آیا تو وہ دیوانوں کی طرح آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر ادھر ادھر دیکھنے لگی اور سوچنے لگی "میرے اللہ ——— آج عید ہے سب کے بچے خوشی خوشی عمدہ عمدہ کپڑے پہنے اپنی ماؤں کے کلیجوں کو ٹھنڈا کر رہے ہیں ——— میرا لال مجھے چھوڑ کر کس دیس کو سدھار گیا۔

اور وہ ـــــ معلوم نہیں ان پہ کیا گزر رہی ہوگی ۔ میرے پاس تو اتنا بھی نہیں کہ بچے کو ایک ہی آئینہ جوڑا ہی دے سکوں "۔ ثریا نے جھک کر بچہ کی طرف دیکھا ـــــ ماں کی مامتا نے جوش مارا ـــــ اس نے ایک بار پھر جھک کر بچہ کو پیار کیا ۔ اور بولی ۔

" جاتی ہوں ـــــ میرے لال ! ـــــ آج عید کا دن ہے لوگوں کے بچے نئے نئے کپڑے پہنے ہیں ، شاید کوئی رحم کھا کر تیرے جوڑے کے لئے بھی دو گز کپڑا دیدے ۔

یہ کہہ کر ثریا کھڑی ہوگئی اور دروازہ کی جانب چلی ۔ پھر ایک بار مڑ کر بچہ کی طرف دیکھا ۔

" میرے لال ! ـــــ اکیلے ڈرنا مت ۔ میں جا رہی ہوں ۔ آج تجھے نئے کپڑے پہنا کر دولھا بناؤں گی ۔ تجھے معلوم نہیں آج عید ہے " ـــــ یہ کہتی ہوئی ثریا تیزی سے دروازہ سے نکل گئی ۔

سورج ڈوب رہا تھا ، دن کی روشنی اندھیرے سے الجھ رہی تھی اس وقت ایک عورت پھٹے چیتھڑوں میں لپٹی ہوئی شہر کی طرف جانے والی سڑک پر بیٹھی ہوئی نہایت دردناک لہجہ میں آہستہ آہستہ کہہ رہی تھی ۔

" خدایا کیا اس بھری دنیا میں کوئی بھی دل ایسا نہیں جس کو میری بیکسی پہ رحم آئے " جب کوئی قریب سے گزرتا تو اس بدنصیب کا ہاتھ اٹھتا کہ شاید کوئی اپنے

بچوں کی خیرات چند سے ہات پر رکھ دے۔ مگر جب وہ دیکھتی کہ لوگ حقارت آمیز نظروں سے اسے دیکھتے ہوئے گزر گئے تو پھر اس کا لرزتا ہوا ہات آہستہ آہستہ نیچے گر جاتا، آخر نا امید ہو کر ایک بار دلخراش آواز میں چلائی۔

"میرے بچے کے لئے دو گز کفن"۔——— وہ آگے کچھ بول نہ سکی۔

ایک راہ گیر نے پہلی بار کوئی چیز اس کے ہات پر رکھی ——— اب اس کو اطمینان ہوا وہ تیزی کے ساتھ چل دی۔

بچو ——— یہ بدنصیب عورت وہی ثریا تھی"——— بڑھیا نے کہا اس کو ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ اس کی کہانی کے دردناک واقعات سے آسمان کے تارے بھی لرز رہے تھے۔

"رات ——— آہ ——— وہ رات میں کبھی نہ بھولوں گی ——— جب اندھیری رات نے سایہ کا بھی ساتھ چھڑایا تھا۔ بدنصیب ثریا نے چاروں طرف ایک پرحسرت نگاہ ڈالی اور تیزی کے ساتھ اپنی جھونپڑی میں داخل ہو گئی ——— اس نے دیا روشن کیا اور اس کی ہلکی ہلکی روشنی میں اپنی مٹھی کھولی، اس کے منہ سے ایک آہ نکلی۔ یہ ایک کھوٹا سکہ تھا جو نئی نویلی بھکارن کا پہلا تجربہ تھا۔

ثریا نے ایک دہشت ناک قہقہہ لگایا اور چاروں طرف آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھنے لگی پھر مردہ بچہ کی لاش کو اٹھا کر گلے سے چمٹا کر باہر نکل گئی۔

بچو! ——— سن رہے ہو؟۔

بڑھیا ہائے بدنصیب بہن کہہ کر خاموش ہو گئی۔ اس کی آنکھوں سے دو موٹے موٹے آنسو نیچے گرے اور آتش دان کی راکھ میں جذب ہو گئے۔

MC LIBRARY Nankana Sahib
Acc. NO: 00388NS
Date: 06-4-2022
Managed by Chughtai Public Library